خلافت سے احرار تک

rekhta

مجلس احرار

مجلس احرار اسلام کا قیام بظاہر ایک جماعت کے طور پر تو ۱۹۲۹ء میں عمل میں آیا۔ لیکن مجلس احرار اسلام کے بانی اور رہنما اس وادیٔ خارزار میں نئے نہیں تھے، وہ سیاست کی وادی میں ایک دہائی گذار چکے تھے، ان کے تلوے اس راہ کی خاک سے آلودہ تھے، ان کے دامن اس راہ کے کانٹوں سے تار تار تھے، جیل ان دس سالوں میں ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے حوصلے بلند اور ولولے جوان تھے۔ جب انہوں نے مجلس احرار بنائی تو اس وقت وہ پنجاب کے شہروں اور پڑھے لکھے لوگوں میں معتوب تھے۔ ان کا شمار نہرو رپورٹ کے حامیوں میں ہوتا تھا، اور پنجاب کے برسر اقتدار مسلمان سیاستدان اور ملازمتوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پڑھا لکھا مسلمان اس نہرو رپورٹ کا مخالف تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ مجلس احرار اسلام کے بانی اور رہنمایان کرام کا خمیر کس طبقے کی مٹی سے ابھرا تھا کہ ان میں، سر فضل حسین، سر فیروز خان نون، سر شہاب الدین اور ان کے حامیوں کی فوج ظفر موج کے سیاسی موقف کی مخالفت کا یارا تھا۔ اصل یہی طبقاتی فرق ہی مجلس احرار اسلام کو متنازع فیہ جماعت بناتا ہے اور اسی طبقاتی بعد نے عالموں، مورخوں اور تجزیہ نگاروں کو اس جماعت اور اس کے رہنماؤں کے متعلق کبھی کچھ لکھنے کی

توفیق نہیں دی۔ کیونکہ جس طرح سے افراد اپنے طبقے کی بنیاد پر عزت و تکریم کے حقدار ٹھہرتے ہیں بالکل اسی طرح جماعتیں بھی طبقات کی بنیاد پر ہی جانچی جاتی ہیں' اور جب طبقات کی بنیاد پر چھان پھٹک ہونے لگتی ہے تو مذہب ایک اضافی صفت رہ جاتا ہے' بنیادی بات نہیں ہوتا ورنہ کیا وجہ ہے کہ مسلم لیگ جس کے قائدین نظریاتی طور پر مسلمان ہوں تو ہوں لیکن عملاً ان کی زندگی مذہب کے احکام اور ان کی پابندیوں سے بہت دُور تھی۔ لیکن ان کے مقابلے میں مجلس احرار اسلام کے رہنما عالمانِ دین اور زاہدان شب بیدار تھے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند وضع قطع سے شرع محمدیؐ کے مکمل نمونہ، لیکن مقبولیت عامۃ المسلمین کا جب سوال آیا تو یہ زاہد شب بیدار اور صوم و صلوٰۃ کے پابند علماء دین معتوب ٹھہرے اور مسلم عوام کے حضور داڑھی منڈے صوم و صلوٰۃ سے بے نیاز مسلم لیگی رہنما کامیاب و کامران ٹھہرے آخر کیوں۔؟

اگر مذہب اور اسلام مسائل کی بنیاد بنتا تو پھر مسلم عوام ان علمائے دین کی آواز پر لبیک کہتے اور جب مجلس احرار نے مسلم لیگ کی یلغار کو روکنے کے لیے حکومت الہیہ کی قرارداد پاس کی تھی (اگر اسلام کا نعرہ ہی اہم ہوتا) تو وہ اس یلغار کو روکنے میں یقیناً کامیاب ہو جاتی۔ اس لیے کہ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ،

> مجلس احرار اسلام واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ جغرافیائی یا نسلی یا لسانی وغیرہ حدود کو قائم کرنا یا برقرار رکھنا مسلمان کا مذہبی یا حقیقی اور قطعی فریضہ ہے بلکہ ہر حالت میں خدا اور رسول کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا دنیا میں نیکی سے رہنا، نیکی سے تعاون کرنا، نیکی کی حکومت قائم کرنا اور نیکی کو رواج دینا ہی خلقت انسانی کی خداوندی حکمت و مصلحت ہے اور مجلس احرار اسلام، دنیا کے جس حصے میں بھی ممکن ہو حکومت الہیہ کے قیام کی خواہاں ہے تاکہ دنیا کو دکھایا جا سکے کہ اسلام کے زریں اصولوں پر کاربند ہو کر کس طرح دنیا کے مصائب کا علاج کیا جا سکتا ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے؟
>
> اس ضمن میں مجلس احرار اسلام یہ واضح کر دینا بھی مناسب سمجھتی ہے کہ

کسی علاقہ میں محض مسلمانوں کی اکثریت یا افراد کے ہاتھوں میں حکومت کا آجانا حکومت الہیہ کا مترادف نہیں بلکہ ایسی شخصی یا جماعتی حکومتوں نے جو اسلام کے نام پر اپنی اغراض کی تکمیل کے درپے ہیں، اسلام کے روئے روشن پر دھبہ لگایا اور دنیا کو اسلام سے متنفر ہونے کی گنجائش دی۔ مجلس کسی ایسے تجربہ کو دہرانے کے لیے مسلمانوں کی دین سے بے بہرہ کسی جماعت یا گروہ کے ہاتھ حکومت دے کر مطمئن نہیں ہو سکتی اور وہ مسلمانوں سے پرزور درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی ذمہ داری کا فوری اور کلی احساس کریں اور اپنی نگاہ سے حکومت الہیہ کو اوجھل کر کے اسلام کے نام پر الحاد و زندقہ کے فروغ کا موقعہ نہ دیں۔ بلکہ سب مسلمانوں کو اطاعت خدا اور رسول پر کمربستہ ہونے کی تلقین و تاکید کریں۔" (تاریخ احرار، افضل حق صفحہ ۔۴۶)

اب اس حکومت الہیہ کے نعرے اور اسلام کی حکمرانی کے مژدہ جانفزا کے مقابلے میں مسلم لیگ کی وہ قرارداد ملاحظہ فرمائیے جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں منظور کی گئی اور جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی، اس میں فقط یہ کہا گیا:

"کل ہند مسلم لیگ کا پہلا اجلاس دستوری معاملات کی نسبت لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کی کارروائی کی، جو ان کی تجویز مورخہ ۲۷ اگست کو ۱۸ ستمبر ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء سے ظاہر ہے۔ توثیق کرتے ہوئے پوری شدت کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ وفاق جسکی دستور ہند بابت ۱۹۳۵ء پر تشریح کی گئی ہے اس ملک کے حالات کے اعتبار سے قطعاً ناموزوں اور ناقابل عمل ہے اور مسلم ہندوستان کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں قرار پایا کہ کل ہند مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کوئی دستوری خاکہ اس ملک میں قابل عمل یا مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔

جب تک مندرجہ ذیل بنیادی اصول کے تحت مرتب نہ کیا گیا ہو
جغرافیائی حیثیت سے متصل ارضی وحدتوں کے مابین حدود قائم کر کے

ان کو جداگانہ علاقوں پر منقسم کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ضروری معلوم ہوتا ہے ان رقبہ جات میں جہاں بلحاظ تعداد مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً شمال مغربی ہندوستان کے مشرقی علاقوں کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے اسی طرح متحد کرنا چاہیئے کہ ان میں سے ہر ایک وحدت خود مختار ہو۔

ان آزاد علاقوں اور خود مختار وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کے لیے ان ہی کے مشورہ سے معین اور مؤثر تحفظات مہیا کرنا چاہئیں۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں دستور میں ان کے لیے معین اور موثر تحفظات شامل کیے جائیں۔ تاکہ ان کے مذہبی، ثقافتی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی خود ان کی مشورت کے ذریعے حفاظت ہو سکے۔ یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ مذکورہ بالا بنیادی اصول کی روشنی میں دستور کا خاکہ ترتیب دے تاکہ ہر وحدت آخر کار تمام اختیارات جن کا تعلق دفاع، خارجہ امور، مواصلات، کسٹم اور دوسرے ضروری امور سے ہو خود سنبھال سکے۔"

یہاں کہیں حکومت الہیہ کا ذکر نہیں ہے کہیں اس میں الحاد و زندقہ کے روکنے کا نعرہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ قرارداد برصغیر کے مسلمانوں کو بالعموم مجتمع کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ بنیادی سوال تو یہ ہے کہ آخر کیوں ایسا ہوا۔ آخر کیوں احرار کی تمام جانفشانیاں، شعلہ بیانیاں قید و بند کی صعوبتیں، مذہبی جذبات کی بنیاد پر لوگوں کو مجتمع کرنے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں؟

اس بنیادی مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہمیں مجلس احرار کی تاریخ کو پنجاب کی تاریخ کے پس منظر میں سمجھنا ہوگا۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر مجلس احرار پنجاب کے مسلمانوں ہی کی تحریک تھی۔ یہ درست ہے کہ اس کا اثر و رسوخ متحدہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں تک بھی پہنچا۔ لیکن اس اثر و رسوخ کے باوجود اس کی سیاست اور اس کے بنیادی تقاضوں پر چھاپ پنجابی مسلمانوں کے ایک طبقے کی ضرورتوں ہی کی رہی۔ یہ طبقہ کون سا تھا جس نے

لیڈر رہنما تو پیدا کر دیئے لیکن وہ مسلمانوں کو مجموعی طور پر قیادت نہ بخش سکا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے احرار کے قیام کے پس منظر اور اس کی طبقاتی حیثیت کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی خود نوشت سوانح "میری زندگی" میں لکھا ہے:

"کراچی کانگریس کی آخری کارروائیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ اس نے آئندہ سال کے لیے ورکنگ کمیٹی منتخب کی۔ اس کمیٹی کا انتخاب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کرتی ہے۔ مگر کچھ عرصے سے یہ طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ جو شخص کانگریس کا صدر ہوتا ہے۔ وہ (گاندھی جی اور کبھی کبھی بعض اور رفیقوں کے مشورے سے) ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے نام تجویز کرتا ہے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں جو ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا۔ اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا۔ جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بعض ممبروں کو انتخاب پر (خصوصاً ایک مسلمان کے نام پر) اعتراض تھا۔ شاید انہیں یہ شکایت بھی تھی کہ ان کے حلقے میں سے کوئی بھی نہیں لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ پندرہ آدمیوں کی آل انڈیا کمیٹی میں ہر گروہ کی نمائندگی ناممکن تھی اور اصل نزاع جس کا ہمیں کچھ علم نہ تھا، محض ذاتی اور مقامی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتراض کرنے والا گروہ رفتہ رفتہ کانگریس سے علیحدہ ہو گیا۔ اور اس نے مجلس احرار کے نام سے اپنی ایک انجمن بنالی۔ پنجاب کے بعض نہایت سرگرم اور ہر دل عزیز مسلمان کانگریسی کارکن اس انجمن میں شریک ہو گئے اور انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ لوگ زیادہ تر نچلے اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا عام مسلمانوں پر بڑا اثر تھا۔ یہ ایک زبردست انجمن بن گئی جو اونچے طبقے کے فرقہ پرست مسلمانوں کی فرسودہ جماعت سے کہیں زیادہ قوت رکھتی تھی۔ اس لیے کہ اس جماعت کی کارروائیاں محض ہوائی تھیں، یا یوں کہنا چاہیئے کہ محض دیوان خانوں اور کمیٹی کے کمروں تک محدود تھیں۔ لازمی طور پر احرار کی انجمن رفتہ رفتہ فرقہ پرستی کی طرف مائل ہو گئی۔ مگر چونکہ ان کا تعلق

عام مسلمانوں سے تھا۔ اس لیے وہ ایک زندہ جماعت تھی اور بعض مبہم معاشی خیالات بھی رکھتی تھی۔ آگے چل کر دیسی ریاستوں خصوصاً کشمیر کے مسلمانوں کی شورشوں میں جہاں بدقسمتی سے معاشی شکائتیں فرقہ پرستی میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ احرار نے بہت اہم حصہ لیا۔ احرار پارٹی کے بعض لیڈروں کے کانگریس سے الگ ہو جانے سے پنجاب کی کانگریس کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر کراچی میں ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے الگ ہو جانے کی وجہ صرف وہ ناراضی ہی نہیں تھی، جو ورکنگ کمیٹی کے انتخاب سے پیدا ہوئی۔ یہ تو محض علامت تھی۔ جس سے صورت حال کا اظہار ہو گیا۔ اصل اسباب کچھ اور تھے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے بجا کہا کہ یہ بہانہ بن گیا۔ اسباب کچھ اور تھے، اور یہ بھی عین ممکن کہ پنڈت جی اس بہانے کی بھی صحیح نشاندہی نہ کر پاتے ہوں لیکن جہاں تک ان کا احرار کے طبقاتی حیثیت کے تجزیہ کا تعلق ہے وہ بالکل درست ہے۔ گو چودھری افضل حق نے پنڈت جی کے اس تجزیہ کو اپنی تضحیک سمجھا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں یہی طبقہ بالخصوص مسلمانوں کا یہ طبقہ ایک زبردست انقلابی رول ادا کر سکتا تھا اور یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ یہی طبقہ تھا جو مسلمانوں کی سیاست میں ایک اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو پنجاب کی ہی نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ شمالی ہند کی مسلم سیاست دراصل اس نچلے درمیانے طبقے اور اوپری طبقے کی متحارب سیاست، ان کی متضاد آرزوؤں، خواہشوں، اور ان متضاد خواہشوں اور آرزوؤں سے مرتب ہونے والی سیاسی پالیسیوں اور ان پالیسیوں کو بروئے کار لانے کے لیے مختلف طریق کار کے دست و گریبان ہونے کی کہانی ہے۔ بدقسمتی سے اس خطے میں ابھرنے والی ان تحریکوں کو اس پس منظر میں دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ حالانکہ مسلمانوں کی سیاسی نشوونما میں اس طبقے کی تحریکوں کا ایک بہت ہی اہم رول رہا ہے۔ ان سیاسی جماعتوں پر تحقیق و تفحص نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ نچلے درمیانے طبقے کی نمائندگی کرتی تھیں۔ اور یہ طبقہ اپنی تمام جانفشانیوں اور قربانیوں کے باوجود مسلمانوں کو وہ قیادت نہیں بخش سکا جو اس دور کے ابھرتے ہوئے نیم سرمایہ دار و جاگیردار کو اقتدار تک پہنچا دیتی۔ مسلم سیاست میں یہ تضاد

کوئی مجلس احرار سے ہی شروع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کے ڈانڈے دراصل ہماری سیاست میں بہت ہی گہرے پیوست ہیں، کبھی یہ علی گڑھ اور دیوبند کی صورت میں ظاہر ہوتے تو کبھی مولانا شبلی کو اپنے انہی غیر واضح اور مبہم جذبات کا اظہار اپنی نظم میں کرنا پڑا۔ مولانا شبلی کی نظم کا عنوان ہے "مسلم لیگ" اور نظم یہ ہے:۔

لیگ کے عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظر لطفِ رئیساں، خوش انجام بھی ہے
کون ہے جو نہیں اس حلقہ قومی کا اسیر
اس میں زہاد بھی ہیں، رندِ مئے آشام بھی ہے
فیض ہے اس کا باندازہ طالب، معنی
بادۂ صاف بھی ہے، دردِ تہہ جام بھی ہے
کعبہ قوم جو کہتے ہیں، بجا کہتے ہیں
مرجع خاص ہے یہ قبلہ گہہ عام بھی ہے
پختہ کاروں کے لیے آلۂ تسخیر ہے یہ
نوجوانوں کو صلائے طمع خام بھی ہے
رہنمایان نو آموز کا ہے مکتب درس
زینۂ فخر و نمائش گریٔ عام بھی ہے
جن مہمات میں درکار ہے ایثار نفوس
ان میں طرزِ عمل بوسہ و پیغام بھی ہے
صدمۂ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پُر آب
دل میں غمخواریٔ ترکان نکو نام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں

محسن قوم بھی ہے خادم حکام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی
جس طرح "صرف" میں ایک قاعدہ ادغام بھی ہے
اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا سامان ہے درست
ورق سادہ بھی ہے، کلک خوش اندام بھی ہے
ہیں قرینے سے سجائی ہوئی چیزیں ہر سُو
جا بجا دفتر پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل
کچھ اسسٹنٹ ہیں، کچھ حلقہ خدام بھی ہے
ہو جو تعطیل میں تفریح و سیاحت مقصود
سفر درجہ اوّل کے لیے دام بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گذارش ہے حضور!
گرچہ یہ سُوءِ ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے
مجھ سے آہستہ میرے کان میں ارشاد ہو یہ
سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے

اور پھر ایک وقت میں اس برصغیر کے بسنے والے مسلمانوں کے احتجاج کے اظہار کے لیے خلافت کمیٹی قائم کرنا پڑی۔ مسلم لیگ اس کام کے اہل نہ ہو سکی یہ دراصل اہلیت اور قیادت، تحریک کے طبقاتی پہلو کی نشاندہی کر رہی تھی اور مجلس احرار اور اس کی قیادت میں چلنے والی تحریکوں کو دراصل اس وقت تک سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ جب تک کہ پنجاب ہی کیا ہندوستان میں خلافت تحریک اور اس کے اثرات کو ذرا تفصیل سے نہ جانچا جائے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں میں کون سے طبقے کو اس زمانے کے ناسازگار حالات نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ جس نے اپنے احتجاج کے لیے خلافت کی تحریک کو اپنایا اور اس تحریک کو اپنے دکھوں کا مداوا تصور کیا۔ کیونکہ مجلس احرار کا بنیادی خمیر اسی

تحریک خلافت سے ابھرا تھا۔ اور انہوں نے آخر دم تک تحریک خلافت نے جو طریق کار وضع کیا تھا اسے ہی نبھانے کی کوشش کی اور یہی طریق کار ایک طرف ان کی مقبولیت کا باعث بنا اور دوسری طرف ان کی شکست بھی اسی طریق کار کی وجہ سے ہوئی۔ کیوں کہ یہ طریق کار نئے حالات میں نہ تو کارگر تھا۔ اور نہ سود مند۔ اور یہی نہیں بلکہ جو طبقات نئے حالات میں آگے آ رہے تھے، ان طبقات کو مجلس احرار کے طریقے اور منزل دونوں ہی متاثر نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ احرار کے سب سے اہم مفکر چوہدری افضل حق تحریک خلافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"غیرت نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا واحسرتا یہ ہوا مسلمانوں کا انجام، پھر اس نے نظریں نیچی کر لیں اور کہا کیا کلمہ گویوں میں کوئی رجل رشید نہیں رہا۔ جو بربادیٔ اسلام پر آنسو ہی بہائے اور خدا سے پریم کھیلنے کے لیے جان کا جوا لگا دے اور مسلمانوں کی بگڑی بنانے کے لیے ہندوستان میں اٹھے اور اندوہ گین ملت اسلامیہ کا سر اونچا کرے؟ بہتوں نے دل کے کانوں سے اس آواز کو سنا، تھوڑے حوصلے کر کے گھروں سے نکلے۔ اُمرا بدستور دادِ عیش دیتے رہے۔ صوفیا، روحانیت کے گوشوں میں ڈرے سہمے بیٹھے رہے۔ درمیانے طبقے کے کچھ اور نچلے طبقے کے زیادہ تعداد پر مشتمل لوگوں نے۔ خلافت کمیٹی۔ کی بنیاد رکھی۔ اور چاہا کہ روٹھی ہوئی قسمت کو زاری اور زور سے منائیں راستے کی مشکل اور منزل کی دوری نے سب کو دل گرفتہ کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کی بہت سی تحریکیں نامرادی کی نیند سو چکی تھیں اب بھی انگریزی سطوت کی علم بردار ہندوستانی پولیس ہر طرف مستعد نظر آتی تھی، جس فوج نے ہزاروں میل دور جا کر اسلامی ممالک کو تاراج کیا تھا۔ انہیں یہاں کلمہ گویوں کا سر قلم کرنے میں دریغ کیا تھا۔ عوام کے ہاتھ میں محض کلرکی کا قلم رہ گیا تھا۔ جہاد کے ابتدائی سامان سے محروم قوم خم ٹھوک کر میدان میں کیا نکلتی؟ احتیاج نے شیروں کو روباہ مزاج بنا دیا اور احتیاط کا تقاضا یہ ہوا کہ ممیا کر بھیڑیے

سے رحم کی درخواست کی جائے۔ روح جہاد کو ترک کر کے زیادہ سے زیادہ مسکین بننے کا مسلک اختیار کیا جائے۔ جو مخالف کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ مار اور مار کہہ کر مارنے والے کو زچ کرتا ہے اور دیکھنے سننے والے کے رحم کو مدد کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ مہاتما گاندھی اس اصول سیاست کا ماہر مانا جاتا تھا۔ اس بنیے کو یہ بزرگی سونپ دی گئی کہ پہلے تم ہی اپنے مزاج کے مطابق مار کھا کر دوسرے کو مہربان کرنے کے دعوے کی دلیل پیدا کرو۔ گاندھی فطری طور پر آندھی ہے۔ شوکت علی اور محمد علی کا مسلمانوں میں اسے سہارا ملا تو اس نے ملک میں طوفان کھڑا کر دیا۔ طول و عرض میں انگریزوں کے لیے فتنے بیدار ہو گئے۔ ایک دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ تخت سلطنت ہل گیا ہے۔ مردہ دل ہندوستانیوں میں آثار زندگی پیدا ہو گئے۔ گویا خزاں دیدہ ہندوستان میں بہار آ گئی۔ ناگاہ چورا چوری کے واقعہ ہائلہ نے گاندھی جی کے مزاج میں اعتدال پیدا کر دیا۔ رسول نافرمانی کے سرپٹ گھوڑے کو یکدم روک دیا گیا۔ سب سیاسی کارکن محسوس کرنے لگے کہ وہ اونچی جگہ سے پتھریلی زمین پر گرے ہیں۔ اور انہیں دن کو بھی چوٹ سے تارے نظر آنے لگے ہیں۔ قوموں کا بگڑ کر بننا اور تحریکوں کا رُک کر چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میدان جنگ میں ایک چال چوک جانے سے بھاگڑ مچ جاتی ہے۔ کانگرس اور خلافت کی صفوں میں انتشار سا پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کے بے عمل اعلےٰ طبقے کو یہ موقعہ خدا دے۔ انہوں نے کہا بنیے بقال کو قوم کا سردار بنانے والے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ گویا وہ خود تلوار ٹیک کر جہادِ زندگی کو نکلے ہیں اور جو کام گاندھی، شوکت علی، محمد علی انجام نہ دے سکیں یہ آرام طلب اُمراء آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ جب تک خلافت کی تحریک زور پر تھی، بلوری گلاسوں میں گھونٹ گھونٹ شربت پینے والے نازپروردہ اُونچے گھرانے والوں نے دم نہ مارا۔ اب ترک رسول نافرمانی کے بعد یہ کھل کھیلے، کہا کہ خلافت لفنگوں کی جماعت ہے۔ یہ پبلک کے چندوں پر پرورش

پانے والے لوگ قوم کی خدمت کیا کریں گے؟

نچلے درمیانے طبقے کی زبوں حالی

ہندوستان میں مسلمانوں کا یہ نچلا درمیانہ طبقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے ہی بے چینی اور محرومی کا شکار چلا آرہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے، ہمارے ہاں ایک طرف اگر کسان نے بنگال میں مزاحمتی تحریک کی بناڈالی تو دوسری طرف گھریلو دستکاری کی تباہی نے اس چھوٹے دستکار کو بے روزگار کر کے تباہی کے غار میں دھکیل دیا۔ اور ہندوستان میں مسلم سوسائٹی کے انہی عناصر نے نچلے درمیانے طبقے کی تشکیل کی۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ چھوٹی صنعتوں میں زیادہ تر مسلم آبادی ہی مصروف تھی، ان میں جولاہے ہوں یا لوہار، ترکھان ہوں یا دیہات میں چھوٹا موٹا کام کرنے والے پیشہ ور، یہ سب مسلمان ہی ہوا کرتے تھے۔ برطانوی حکومت نے ابتدا سے ہی کس طرح ہندوستان کی صنعت کو تباہ و برباد کیا۔ اس پر خود برطانوی مؤرخوں نے صفحات سیاہ کیے ہیں۔ اس لیے میں یہاں صرف ایک دو حوالوں پر اکتفا کروں گا لیکن انگریز نے جو صنعت تباہ کی اس نے پورے ایک طبقے کو متاثر کیا کیونکہ اس وقت ہمارے ہاں مشین نہیں تھی۔ بلکہ دستی صنعت کاری ہی تھی۔ اور جب یہ صنعت تباہ ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا دستکار جو دیہات اور شہر میں اپنے کام کاج میں مصروف تھا وہ تہس نہس ہو گیا۔ اب اندازہ لگائیے کہ ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۲ء کے درمیان ۱۷ سال میں ہندوستان کی سوتی مال کی برآمد ۱۳ لاکھ پاؤنڈ سے گر کر ایک لاکھ پاؤنڈ رہ گئی۔ یعنی ۱۳ گنا کمی ہو گئی اس کے مقابلے میں ہندوستان میں درآمد ۲۶ ہزار پاؤنڈ کی مالیت کے مال سے بڑھ کر ۴ لاکھ پاؤنڈ کی مالیت تک پہنچ گئی۔ یعنی تقریباً ۱۶ گنا اضافہ ہوا۔ ہندوستان جہاں سے ایک زمانے میں ساری دنیا کے لیے کپڑا جاتا تھا۔ اب برطانیہ کی ساری برآمد کا ایک چوتھائی درآمد کرنے لگا۔ صرف یہی نہیں کہ مشین کے بُنے ہوئے برطانوی کپڑے نے ہندوستان کے کپڑا بُننے والے جولاہوں کو تباہ کر دیا۔ بلکہ مشین کے بُنے دھاگے نے دھاگہ بُننے والوں کو بھی فنا کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۳۶ء کے درمیان سوتی دھاگے کی ہندوستان میں درآمد میں ۵۲ ہزار گنا اضافہ ہوا۔ نتیجہ

کیا ہوا کہ کپڑا بننے والا جولاہا، سوت کاتنے والی آبادی کپڑے کی تجارت کرنے والے تمام افراد اس تباہی سے متاثر ہوئے۔ اس لیے یہ کوئی حیرانی کی بات تو نہیں کہ مومن کانفرنس ہو یا مجلس احرار، جمعیۃ علمائے ہند ہو یا خلافت، ان سب تحریکوں نے ابتداءً اسی نچلے درمیانے طبقے کو متاثر کیا۔ صرف متاثر ہی نہیں کیا۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے اصلاً برطانوی مصنوعات کے بائیکاٹ کا خیر مقدم ہی نہیں کیا بلکہ دل و جان سے قبول کیا۔ اس لیے کہ یہ وہ طبقے تھے جن کو برطانوی مصنوعات نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس لیے وہ برطانوی شہنشاہیت کے ہاتھوں پٹ کر اس کے خلاف لڑ مرنے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ یہ بھی کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ آج بھی جمعیت علماء والے ہوں یا پرانے احراری وہ کھدر کو پسند کرتے ہیں۔ مولانا داؤد غزنوی ہوں یا مولانا احمد علی یا امیر شریعت یہ لوگ آخر دم تک کھدر پہنتے رہے، اس کی وجہ ان کا اس نچلے درمیانے طبقے سے گہرا ناطہ تھا اور یہی ناطہ ان کو آخر دم تک انگریز اور انگریزی زبان دشمنی کی راہ سے نہ ہٹا سکا اور مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی جو آج بھی سامراج دشمنی کے مورچے پر ڈٹے ہوئے ہیں ان کی بنیادی وجہ یہی ان کی وہ پرانے اجڑے ہوئے دستکار اور محروم کسان سے قربت ہے جو، ان کو اس مورچے پر ڈٹے رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ تاہم آج کی صورت بہت حد تک مختلف ہے۔ لیکن پہلی جنگ عظیم سے پہلے حالات بہت پریشان کن تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے کمشنر نے جو اپنی رپورٹ مرتب کی تھی، اس میں اس صورت کا نقشہ کھینچا تھا اور لکھا تھا:

"ہندوستان میں ولایت کے بنے ہوئے کپڑے اور برتن بڑی مقدار میں درآمد کیے جا رہے ہیں اور خود ہندوستان میں مغربی نمونے کی بڑی بڑی کمپنیاں قائم کی گئی ہیں، جنہوں نے بہت سی دیہاتی صنعتوں کو کم و بیش تباہ کر دیا۔ زرعی پیداوار کی قیمتیں بڑھ گئیں، جس کی وجہ سے دیہاتوں کے بہت سے دستکاروں نے اپنا خاندانی پیشہ ترک کر دیا اور زراعت کی طرف رخ کرنے لگے۔ دیہات کا پرانا نظام ملک کے مختلف حصوں میں جس رفتار سے ٹوٹ رہا ہے اس میں ہر جگہ فرق ہے جو صوبے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہاں

تبدیلی بھی بہت نمایاں ہے۔

اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں گھریلو صنعتوں کا زوال کس تیزی سے رونما ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء کے درمیان صنعتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد میں ۲۰ لاکھ کی کمی آگئی حالانکہ آبادی میں ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ چنانچہ ایک طرف گھریلو صنعتوں کی تباہی نے ایک فوج ظفر موج کو بے کاری کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا۔ اس یاس و نا امیدی کی فضا میں ان کے پاس ایک ہی چارہ تھا کہ زراعت میں اپنی قسمت آزمائی کریں۔ لیکن زراعت میں پہلے ہی بوجھ زیادہ تھا۔ یہ صورت حال تھی، جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا اعلان ہوا۔

فوجی بھرتی

اس اعلان جنگ کا مطلب کیا تھا کہ ہندوستان برطانیہ کی پوری مدد کرے۔ اس امداد کی سب سے پہلی صورت یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ نوجوان فوج میں بھرتی ہو کر محاذ جنگ پر جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے پنجاب کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ کیوں کہ اس برصغیر میں پنجاب فوج کی بھرتی کا سب سے اہم مرکز تصور ہی نہیں ہوتا تھا، بلکہ تھا بھی، چنانچہ پہلی جنگ عظیم کا اعلان جیسے ہی ہوا اس کے فوراً بعد ہندوستان میں فوجی بھرتی کا کام شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کے آخری چار مہینوں میں فوج میں بھرتی ہونے والوں کی پوری کھیپ ۲۸ ہزار نوجوانوں پر مشتمل تھی، یہ تعداد پورے ہندوستان سے بھرتی کی گئی تھی لیکن ان ۲۸ ہزار میں نصف یعنی ۱۴ ہزار صرف پنجابی نوجوان تھے۔ اسی طرح ۱۹۱۵ء کے پورے سال میں ۹۲ ہزار رنگروٹ پورے ہندوستان سے بھرتی ہوئے ان میں سے پھر نصف یعنی ۴۶ ہزار پنجابی تھے، ۱۹۱۶ء کے آخر تک پورے ملک سے دو لاکھ پچیس ہزار نوجوان فوج میں بھرتی کیے جا چکے تھے، ان میں سے پنجابی نوجوانوں کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار تھی۔ مئی ۱۹۱۷ء میں بین الاقوامی حالات خاصے مخدوش ہو گئے۔ اور برطانیہ کو مختلف محاذوں پر سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ برطانیہ کو مزید فوجوں کی اشد ضرورت پڑی اس مقصد کے لیے اس

نے فوجی بھرتی کا ایک مرکزی بورڈ قائم کیا۔ اس بورڈ نے اعلان کیا کہ پورے ہندوستان سے مزید چار لاکھ اسی ہزار جوان بھرتی کیے جائیں گے۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۱۷ء تک ہندوستان بھر سے ایک لاکھ ۸۶ ہزار جوان بھرتی ہوئے ان میں سے ۹۵ ہزار پنجابی تھے۔ اور ۱۹۱۸ء میں پورے ہندوستان سے تین لاکھ سترہ ہزار جوان بھرتی کیے گئے ان میں سے ایک لاکھ ۳۴ ہزار پنجابی تھے، لیکن اس فوجی بھرتی کے لیے پنجاب کے بسنے والوں کو جن مظالم کو برداشت کرنا پڑا وہ ایک المناک داستان ہے اور دراصل کانگرس اور خلافت کی عدم تعاون کی تحریک کے شعلوں کی تہ میں انہی مظالم کی چنگاریاں ہی تھیں، جنہوں نے پنجاب کے دیہاتی اور گھریلو دستکار کو خلافت کے نام پر انگریز کی غلامی کا جُوا اتار پھینکنے پر مجبور کیا۔ ان مظالم کے ضمن میں بے شمار شہادتیں اور دستاویزات موجود ہیں اور تو اور خود انگریز مصنفوں نے بھی اس سلسلے میں اس وقت کے گورنر اوڈوائر کی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں کو تسلیم کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ خود اوڈوائر نے اپنی خود نوشت سوانح میں اپنی افتادِ طبع پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ فوجی بھرتی کے سلسلے میں اس کا حکم ایک آمر کا حکم تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد صوبے کی پوری نوکر شاہی حرکت میں آجاتی تھی، اس پر کہ ڈاکٹر عاشق بٹالوی نے اپنی اہم ترین کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں اس دور کی چیرہ دستیوں پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ضلع کا ڈپٹی کمشنر افسر مال کے سر پر، افسر مال تحصیلدار کے سر پر، اور تحصیلدار نمبردار کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ جوانوں کی مطلوبہ تعداد، جہاں سے بن پڑے اور جس طرح ممکن ہو، مہیا کی جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پورے گاؤں کو سرکاری اہل کار نرغے میں لے لیتے تھے اور ساری آبادی کو گھروں سے نکال کر قطار میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ جس جوان کی طرف سرکار کی انگلی اُٹھ جاتی تھی، اسے پابجولاں ضلع کے صدر مقام میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اور وہ ضلکارانہ طور پر بھرتی کیا ہوا رنگروٹ تصور ہوتا تھا۔

حکومت کے جابرانہ طرزِ عمل سے پنجاب میں بے شمار فساد ہوئے دیہات

کے باشندوں نے مشتعل ہو کر بھرتی کرنے والے افسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے بلوے ہونا شروع ہو گئے اور بعض جگہ گاؤں کی پوری آبادی کو گرفتار کر کے عدالتوں میں پیش کر دینا پڑا۔

ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں جب بھرتی کے افسروں نے لوگوں پر بہت زیادہ تشدد کیا۔ تو مشتعل ہجوم نے نائب تحصیلدار اور اس کے عملہ پر حملہ کر دیا۔ بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ جن میں باون ملزموں پر زیر دفعہ ۱۴۷ تعزیرات ہند مقدمہ چلا۔ ابتدائی عدالت نے ان کو سزا دے دی۔ لیکن سیشن جج مسٹر کولڈ سٹریم نے (جو چند سال بعد لاہور ہائیکورٹ کے جج بن گئے تھے) سب کو بری کر دیا۔ مسٹر کولڈ سٹریم نے جو فیصلہ لکھا اس کے چند فقرے درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

"لوگوں کو سرکار کے خلاف سچی اور حقیقی شکائتیں ہیں اور وہ اپنی تکلیفوں کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ ضلع مظفر گڑھ کے ماتحت افسروں نے رنگروٹوں کی بھرتی اور جنگی فنڈ کے سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں نمبرداروں اور ذیلداروں پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا ہے۔ چنانچہ ان نمبرداروں اور ذیلداروں کو مجبوراً ایسے قابل اعتراض طریقے اختیار کرنا پڑے جن سے ضلع کے اکثر مقامات پر فسادات رونما ہوئے یہ بہر صورت تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ قابل اعتراض طریقے جو حد درجہ تشدد آمیز بھی تھے۔ حکومت کے ایما اور منشا کے خلاف تھے، تاہم ضلع کے دور دراز مقامات پر یہ تشدد ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔"

ضلع شاہ پور میں جب فساد برپا ہوا اور گاؤں کی آبادی نے بھرتی کے خلاف افسروں پر قاتلانہ حملے شروع کیے تو بے شمار لوگوں پر مقدمات چلائے گئے۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں عجیب و غریب باتوں کا انکشاف ہوا۔ مثلاً یہ کہ جب عوام بخوشی بھرتی ہونے سے انکار کرتے تھے، تو گاؤں کے تمام باشندوں کو گھروں سے باہر کھڑا کر کے مردوں کو عورتوں

کے سامنے برہنہ کر دیا جاتا تھا۔ جس کنبے میں تین یا چار بھائی تھے ان میں سے زبردستی دو بھائیوں کو بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ بیویوں کو خاوندوں سے جدا کر کے دور کہیں اور مقام پر بھیج دیا جاتا تھا۔ اور جب تک ان کے خاوند خود بھرتی ہونے یا اپنے عزیزوں کو بھرتی کرانے پر رضامند نہیں ہو جاتے تھے۔ عورتوں کو واپس گھر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

کرنال کے ایک گاؤں میں جب زبردستی بھرتی شروع ہوئی۔ تو ایک شخص نے مجسٹریٹ کی منتیں کیں کہ اس کا اکلوتا بچہ ہے رحم کیجئے اور بھرتی نہ کیجئے۔ لیکن مجسٹریٹ نہ مانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گاؤں میں سخت فساد ہوا اور بے شمار آدمیوں کی گرفتاری عمل میں آئی جن میں سے پانچ کو عدالت نے سزا دی۔ اپیل میں وہ بری ہو گئے۔ عدالت اپیل نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ:

"ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے وقتاً فوقتاً جو احکام صادر کیے ان میں سے یہ بات قطعی ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر یہ اپیل کنندگان اپنے قریبی رشتہ داروں کو فوج میں بھرتی کرا دیتے یا خود بھرتی ہو جاتے تو ان سے بآسانی درگذر کی جاتی۔"

اسی طرح پنجاب کے مختلف اضلاع میں دیہاتیوں کی بے چینی بڑھنے لگی اور جبر و تشدد سے تنگ آئے ہوئے لوگ فساد پر آمادہ ہو گئے جونہی خبر اڑتی کہ بھرتی کا افسر آ رہا ہے گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں اور کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے، کئی مرتبہ سرکاری افسر گھروں کو لوٹ لیتے اور فصلوں کو تباہ کر دیتے تھے۔

اس سلسلے میں سر مائیکل اوڈوائر کی ایک تقریر کا حوالہ دینے پر مجبور ہوں۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ بھرتی کے بارے میں اس کا اپنا رویہ کیا تھا۔ ۴ مئی ۱۹۱۶ء کو اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ درکار ہیں، اگر لوگ خوشی سے بھرتی نہیں ہوں گے تو ہم جبری بھرتی کریں گے۔ بعض علاقوں میں لوگ بھرتی ہونے سے جی چراتے ہیں، ہم اس صورت حال کا اچھی طرح مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ ہم پنجاب سے رنگروٹوں کی ایک مقررہ تعداد مہیا کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔"

لہٰذا اس وعدے کا ایفا ضروری ہے ۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب کم از کم پنجاب میں اکثر لوگ جبری بھرتی کے حامی بنتے جا رہے ہیں، مثلاً اگر ہر دس پندرہ یا بیس جوان آدمیوں میں سے ایک آدمی بھرتی کر لیا جائے تو یہ شرح بُری نہیں ہوگی۔ مرکزی حکومت نے ہندوستان کے ہر صوبے کے ذمے رنگروٹوں کی ایک خاص تعداد مقرر کر دی ہے۔ میری رائے ہے کہ اگر یہ تعداد رضاکارانہ بھرتی سے مہیا نہ ہوئی تو پھر اور قسم کے ذرائع اختیار کرنا پڑیں گے۔"

یہ اور قسم کے ذرائع کیا تھے۔؟ ان میں سے کچھ تو سطور بالا میں بیان کیے جا چکے ہیں دو ایک مزید واقعات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ داستان طویل ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس شخص کے اعمال کا تجزیہ بے حد ضروری ہے جو اپنے آپ کو دیہاتیوں کا ہمدرد اور خیر خواہ کہتے ہوئے تھکتا نہیں تھا۔ اور جس نے اپنی مذموم کوششوں سے پنجاب کی مسلمان آبادی کو اس طرح دو مخالف حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ اس کے اثرات نے ربع صدی تک ہمیں مبتلائے رنج و محن کئے رکھا۔

گوجرانوالہ کے ایک معزز مسلمان زمیندار نے تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ:۔

"بیساکھی کے مہینے میں تحصیلدار ہمارے گاؤں میں آیا اور رات ہی رات ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ صبح تمام لوگ ڈیرے پر حاضر ہوں ایک تو فصلوں کی کٹائی کے دن تھے، دوسرا یوں بھی لوگ ڈرتے تھے کہ انہیں زبردستی بھرتی کر لیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو بہت کم آدمی ڈیرے پر حاضر ہوئے۔ چنانچہ تحصیلدار سخت ناراض ہوا اور اس نے ساٹھ ستر آدمیوں کو جرمانہ کر دیا۔ جس کی مجموعی رقم سولہ سو روپے تھی۔ پھر تحصیلدار نے حکم دیا کہ گاؤں کے لوگ ضلع کے صدر مقام گوجرانوالہ میں حاضر ہوں جو ہمارے گاؤں سے اٹھارہ میل دُور ہے جب مقررہ تاریخ کو لوگ وہاں گئے تو سب کو قطار میں کھڑا کر کے سات جوانوں

کو فوجی بھرتی کیلئے چن لیا اور باقی آدمیوں کو مارا اور گالیاں دیں اور کہا کہ بھرتی کے لیے اور جوان لے کر آؤ۔"

اگر ہم پنجاب کے مختلف اضلاع میں فوجی بھرتی کے مدد جزر کے نقشے کا بغور مطالعہ کریں تو ایک عجیب بات ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً کسی ضلع میں آج بھرتی معمول کے مطابق ہے تو چند مہینوں کے اندر وہاں بھرتی ایک دم اس قدر تیز ہو جاتی کہ معلوم ہوتا ہے گویا لوگ دیوانہ وار فوج کی طرف لپک لپک کر جا رہے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی سبب تھا اور وہ یہ کہ اگر ضلع کا حاکم ناجائز ذرائع استعمال کرنے اور جبر و تشدد کو روا رکھنے کا حامی نہ ہوتا تھا تو اوڈوائر اس کو فوراً تبدیل کر کے وہاں کسی ایسے آدمی کو متعین کر دیتا تھا جو اس کے ایما کے مطابق بھرتی میں برے بھلے طریقوں میں امتیاز کرنے کا قائل نہ تھا۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۱۷ء کے آخر میں ضلع ملتان کے رنگروٹوں کی تعداد ۷۵۹ تھی۔ گویا ضلع کی آبادی کے ہر ۵۸۶ مردوں میں سے ایک رنگروٹ بھرتی ہوا۔ لیکن سال بھر کے اندر یعنی نومبر ۱۹۱۸ء میں رنگروٹوں کی کل تعداد ۴۶۳۶ ہو گئی۔ گویا ہر ۹۳ مردوں میں سے ایک رنگروٹ لیا گیا۔ اسی طرح اوڈوائر نے دیکھا کہ گوجرانوالہ کے لوگ رضاکارانہ طور پر بھرتی ہونے میں تامل کرتے ہیں، تو اس نے اپنے خاص آدمی کرنل ادبرائن کو وہاں ڈپٹی کمشنر مقرر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۷ء تک تو گوجرانوالہ کے رنگروٹوں کی تعداد ۳۳۸۸ تھی، لیکن اگست ۱۹۱۸ء میں یہ تعداد یکایک ۱۱۷۶۵ تک پہنچ گئی۔ گویا ایک ہی سال میں ساڑھے آٹھ ہزار رنگروٹ بھرتی ہو گئے۔

دیہات کے معززین کی جان عذاب میں آئی ہوئی تھی، نمبرداروں اور ذیلداروں پر آئے دن سرکار کا تازیانہ برستا تھا۔ کہ اور رنگروٹ لاؤ، جن نمبرداروں سے کسی قسم کی معذوری کا اظہار ہوا۔ ان کی نمبرداریاں ضبط کر لی گئیں۔ پولیس حفظ امن میں ان لوگوں کا بے دریغ چالان کر دیتی تھی۔ اور مجسٹریٹ ضمانت لینے کی بجائے انہیں فوراً حوالات میں بند کر دیتے تھے اور جب تک وہ بدبخت رنگروٹوں کی بھرتی کا وعدہ نہ کرتے انہیں رہا نہیں کیا جاتا تھا اوڈوائر نے شہری اور دیہاتی آبادی کے درمیان ایک آہنی پردہ ڈال دینے کی کوشش

کی تھی تاکہ دیہات میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی ہوا شہروں میں نہ پہنچنے پائے۔ لیکن جب دیہاتیوں پر پیہم سختیاں ہونا شروع ہوئیں اور جگہ جگہ فساد پھوٹ پڑے تو صوبے میں ہلچل سی مچ گئی۔ بلوے کے ایک ایک مقدمہ میں پولیس نے بیک وقت سو سو، دو دو سو آدمیوں کا چالان کر دیا تھا۔ جب یہ مقدمات ابتدائی عدالتوں سے ہوتے ہوئے صوبے کی عدالتِ عالیہ تک پہنچے اور صفائی کی طرف سے قابل وکلا پیش ہوئے تو راز ہائے درون پردہ کھلنا شروع ہوئے۔

سر فضل حسین نے جو دو مقدموں میں ملزموں کی طرف سے پیش ہوئے تھے۔ ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا۔

سوال: "جن مقدمات میں آپ پیش ہوئے تھے، ان کی ابتدا کیونکر ہوئی تھی۔؟"

جواب: "یہ دونوں مقدمات ضلع شاہ پور سے آئے تھے، ایک مقدمے میں ملزموں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی جن کے خلاف یہ الزام تھا کہ انہوں نے جبری بھرتی کی مخالفت کی ہے۔"

سوال: "کیا بلوے کے ایک مقدمے میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا چالان کر دیا گیا تھا؟"

جواب: "جی ہاں۔"

سوال: "واقعات کیا تھے۔؟"

جواب: "مجھے اس وقت گاؤں کا نام یاد نہیں۔ یہ گاؤں ضلع شاہ پور میں ہے اور غالباً سرگودھا سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ ان ڈیڑھ سو ملزموں میں سے ایک بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اور جب سے پنجاب میں انگریزی حکومت قائم ہوئی ہے اس گاؤں کا صرف ایک آدمی سرکاری ملازمت میں گیا ہے۔ ملزموں پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا گیا تھا۔ لیکن وہ بھرتی پر آمادہ نہ ہوئے۔"

سوال: "کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ خود ان ڈیڑھ سو ملزموں کو بھرتی ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔؟"

جواب: "جی نہیں، گاؤں کے تمام باشندوں پر جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے

دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔"

سوال: "کیا رنگروٹوں کی کوئی خاص تعداد طلب کی جا رہی تھی۔؟"

جواب: "جی نہیں! کوئی خاص تعداد مقرر نہیں تھی۔ چونکہ اس گاؤں سے کوئی آدمی بھرتی نہیں ہوا تھا۔ اور حکومت زبردستی بھرتی کرنے پر تلی ہوئی تھی اور لوگ بھرتی سے بار بار انکار کرتے تھے، اس لیے حکومت نے یہ خیال کیا کہ گاؤں کے لوگوں نے سازش کر لی ہے۔ چنانچہ حکومت نے قانون تحفظ ہند کے تحت یہ قدم اٹھایا۔"

سوال: "تو کیا حکومت نے یہ قدم گاؤں کی پوری آبادی کے خلاف اٹھایا تھا۔؟"

جواب: "جی نہیں! گاؤں کے چند آدمیوں کے خلاف۔"

سوال: "کیا حکومت نے یہ اقدام اس بنا پر کیا تھا۔ کہ یہ چند آدمی بھرتی کی مخالفت کر رہے ہیں؟"

جواب: "جی ہاں ان چند آدمیوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے، لیکن گاؤں والوں نے انہیں پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر فوج بھیجی گئی اور جب فوج نے گاؤں میں جا کر ادھم مچایا تو بلوہ ہو گیا۔"

سوال: "تو کیا اس بلوے میں ان ڈیڑھ سو آدمیوں کا چالان ہوا تھا۔"

جواب: "جی ہاں۔"

سوال: "پھر کیا ہوا؟"

جواب: "اپیل میں اکثر بری ہو گئے اور چند ایک کو سزا مل گئی۔"

اقتصادی اثرات

پنجاب کی معیشت پر اس فوجی بھرتی کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ بہت ہی مہلک تھے۔ ایک طرف دیہات اور شہر کا چھوٹا صنعت کار پہلے ہی برطانوی مصنوعات اور مشینوں کے ہاتھوں پٹ چکا تھا دوسری طرف فوجی بھرتی نے پنجاب کو غذائی بحران سے بھی دوچار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جس زرعی صوبے کی زراعت پیشہ آبادی کا تمام نوجوان طبقہ کھیتوں سے

ہانک کر فوجی بھرتی کے مرکزوں پر لے جایا جائے۔ اور وہاں سے ان کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا جاتے۔ وہاں کی زراعت کا تباہ ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۲ء کے سالوں میں غذائی قلت کا شدید سامنا کرنا پڑا تھا۔ ۱۹۱۷ اور ۱۹۱۸ کے سال میں گندم کی پیداوار نوے لاکھ ۹۰ ہزار ٹن تھی اور چاول کی پیداوار ۳ کروڑ پچاس لاکھ ۹۰ ہزار ٹن تھی۔ لیکن اس سے اگلے سال یعنی ۱۹-۱۹۱۸ میں گندم کی پیداوار نوے لاکھ ۹۰ ہزار ٹن سے گھٹ کر ۵۰، لاکھ ٹن رہ گئی، اسی طرح چاول کی پیداوار میں بھی تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ ٹن کی کمی واقع ہوئی۔ لیکن اس کمی کے باوجود غذائی اجناس کی برآمدات میں کوئی کمی نہیں ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں قحط کے اثرات مرتب ہونے لگے اور اس میں پنجاب پیش پیش تھا۔ اور ساتھ ہی انفلوئنزا کی وبا پھوٹ پڑی۔ چنانچہ پنجاب میں اس وبا سے متاثر ہونے والوں کے بارے میں جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ ان کے مطابق اس وبا سے متاثر ہونے والوں میں ۵ فیصد یورپی باشندے تھے، ۶ فیصد پنجابی امرا تھے۔ اور دیہاتی آبادی میں ۵۰ فیصد سے زائد باشندے اس وبا سے متاثر ہوئے۔ پورے ہندوستان میں قحط اور وبا کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کی تعداد سوا کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اور ان اموات کے بعد غذائی اجناس کی پیداوار میں اور بھی کمی ہو گئی۔ اور اس کمی نے غذائی اجناس کی قیمتوں میں بلا کا اضافہ کر دیا۔ چنانچہ گندم کی قیمتوں کے رجحان کا گوشوارہ شدید معاشی بحران کی نشاندہی کرتا ہے۔

سال	گندم کی فی من قیمت (آنے)	گندم کی فی من قیمت (روپے)
۱۹۱۳ء	۱۳	۳
۱۹۱۴ء	۵	۴
۱۹۱۸ء	۱۵	۵
۱۹۱۹ء	۵	۷
۱۹۲۰ء	۱۰	۷
۱۹۲۱ء	۱۲	۷

ان قیمتوں میں اضافے کی پشت پر قلت کے ساتھ ساتھ ذخیرہ اندوزی، سٹہ بازی اور برآمد پوری طرح کارفرما تھیں۔ نتیجہ اس وقت بھی یہی تھا۔ جو آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کاشتکار کو تو فوری طور پر اپنی ضروریات کے لیے فصل کو بازار میں لانا پڑتا تھا اور آڑھتی اونے پونے اس سے خرید لیتا تھا اور پھر اس کو اپنے گذر بسر کے لیے مہنگے داموں خریدنا پڑتا تھا۔ گندم جو پنجاب کے بسنے والوں کی غذا ہے، کی مہنگائی نے دیہاتی اور شہر کی غریب آبادی کو شدید طور پر متاثر کیا۔ چنانچہ چھوٹے زمیندار اس معاشی بحران سے تنگ آکر اپنی اراضی کو بڑے اور متمول زمینداروں کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ پنجاب میں ایسے زمیندار جو مزارعوں کی کمائی پر گذر کرتے تھے ان کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ جنگ سے پہلے ایسے زمینداروں کی تعداد ۶ لاکھ ۲۶ ہزار تھی، مگر جنگ کے بعد ۱۹۲۱ء میں یہ تعداد ۱۰ لاکھ ۸ ہزار تک پہنچ گئی۔

اس زمانے میں ہندوستان بھر میں، دیہی زندگی کی بربادی کا نقشہ بہت ہی اندوہناک ہے۔ لیکن مجھے اس وقت صرف پنجاب میں معاشی بحران کا ذکر کرنا ہے۔ اب اس دور میں جب ایک افتاد دوسری افتاد کو جنم دے رہی تھی اور اسی سلسلہ ہائے افتاد کی ایک کڑی ساہوکاروں کی دھاندلی تھی، اور مالک کسانوں کی مالی پریشانیاں، جن کے بل پر یہ ساہوکار کاشت کار اور مالک کسان سے زمین ہتھیا لیتا ہے۔ ان تمام مصائب اور معاشی محرومیوں کا ذکر قدرے تفصیل سے کرنا یوں ضروری ہے کہ ہمارے ہاں تحریکوں کے ظاہری نعروں اور اوپری خولوں کو دیکھ کر ہی تحریکوں کے متعلق تجزیہ کر لیا جاتا ہے اور کوئی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ نچلے درمیانے طبقے کے مسلمانوں، دیہات کے کسانوں، گھریلو دستکاری کے پیشے سے متعلق لوگوں نے ہزارہا میل دور کی خلافت عثمانیہ کی بقا کے لیے جو جیل جانا منظور کیا تھا۔ تو وہ صرف خلافت عثمانیہ کے لیے نہ تھا۔ بلکہ وہ تو انگریز اور اس کی چیرہ دستیوں کے خلاف احتجاج تھا۔ جو کبھی خلافت عثمانیہ کی حفاظت کے روپ میں ظاہر ہوا تو کبھی غازی امان اللہ خاں کی امداد کی صورت میں اور کبھی ہجرت کی شکل میں، دراصل یہ تمام تحریکیں اپنی ظاہری شکل و صورت کے باوجود انسانوں کی مسلسل معاشی پریشانیوں کا مظہر تھیں،

اس لیے تحریکوں کے ظاہری نعروں اور دعووں کے پیچھے کام کرنے والے مختلف عوامل کو سمجھنا لازمی اور لابدی ہے۔

اس پس منظر میں پنجاب میں فوجی بھرتی، گھریلو دست کاری کی تباہی زرعی بحران اور اس پر ساہوکاروں کی اندھیر گردی، سب نے مل کر خلافت اور کانگرس کی عدم تعاون تحریک کا قوام تیار کیا۔

"ساہوکار اور قرض ہندوستان کے سماج کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں لیکن سرمایہ داری اور خاص طور سے سامراجی لوٹ کے دور میں ساہوکار کی حیثیت بہت بدل گئی ہے اور اس کی لوٹ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے پہلے کسان کو قرضہ صرف اپنی شخصی ضمانت پر ملتا تھا اور اس لیے ساہوکاری کا کاروبار نہایت غیر محفوظ اور خطرناک تھا۔ وہ جو کچھ لین دین کرتا تھا اس پر گاؤں کی پنچایت کی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ پرانے قانون کے مطابق قرض خواہ اپنے قرض دار کی زمین پر قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ برطانوی حکومت میں یہ سب قاعدے بدل گئے اس نے جو قانون جاری کیا اس میں قرض خواہ کو قرقی کا حق دار اور زمین منتقل کروا لینے کا اختیار دے دیا اور اس کی وجہ سے ساہوکار کے لیے لوٹ کا میدان کھل گیا حکومت نے اس کی پشت پناہی کے لیے قانون اور پولیس کا ڈنڈا بھی مہیا کر دیا اور اس طرح اسے پوری سرمایہ داری لوٹ کھسوٹ میں ایک لازمی اور مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس لیے کہ ساہوکار نہ صرف مال گذاری کی وصولی میں ایک مفید وسیلہ بنتا ہے بلکہ وہ ساہوکاری کے ساتھ غلہ کی تجارت بھی کرتا ہے۔ وہ فصل کٹنے کے بعد سارا غلہ خرید لیتا ہے اس کو پوری تجارت کا اجارہ حاصل رہتا ہے وہ اکثر بیج اور آلات کے لیے کچھ پیشگی رقم بھی دیتا ہے کسان اپنی جہالت کی وجہ سے بھی اس کے حساب کتاب کا پتہ نہیں چلا سکتے اور اس طرح وہ دل بھر کے لوٹتا ہے اور یہ اس کے جنگل میں پھنستے چلے جاتے ہیں وہ گاؤں کا حاکم مطلق بن جاتا ہے اور اس قرضہ میں زمینیں ساہوکار کے پاس منتقل ہو جاتی ہیں تو پھر یہ لوٹ کا کاروبار ایک منزل اور آگے بڑھتا ہے۔ کسان کھیت مزدور بن جاتے ہیں۔ یا بٹائی پر اسی زمین پر کاشت کرتے ہیں۔ اور پیداوار کا بڑا حصہ لگان اور سود کی مد میں اسکی نظر کر دیتے

ہیں۔ اور وہ ہندوستانی دیہاتوں کی معاشی زندگی میں چھوٹے سرمایہ دار کی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے اور کسان اس کے مزدور بنتے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں کسانوں کا غصہ ساہوکاروں پر اترتا ہے اس لیے کہ بظاہر وہی ان کی اصل تباہی کی جڑ معلوم ہوتا ہے اور اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بعض اوقات ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ یہ پرانے اور صدیوں سے مصیبت اٹھانے والے کسان تنگ آکر ان ساہوکاروں کو قتل کر دیتے ہیں۔ لیکن انہیں جلد یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ ساہوکار کی پشت پر پورا انگریزی راج ہے اور ساہوکار مالیاتی سرمایہ کی لوٹ کی مشین میں ایک اہم پرزہ ہے۔

جب ساہوکار کی لوٹ اپنی حد سے بڑھ جاتی ہے تو حکومت اس کی روک تھام پر مجبور ہو جاتی ہے کہ کہیں سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ہی نہ مر جائے اور خود اس کی لوٹ خطرے میں آجاتے۔ سود کی شرح گھٹانے اور زمین کو منتقل ہونے سے روکنے کے لیے بے شمار قوانین بنائے گئے ہیں، لیکن حکومت کو ماننا پڑا کہ یہ قانون سب ناکام ثابت ہوئے (دیکھیے زرعی کمشن کی رپورٹ میں "قانون کی ناکامی" صفحہ ۳۷-۴۳۶، اس میں بتایا گیا ہے کہ قرض کو بڑھنے سے روکنے کے لیے کیا قانون بنائے گئے اور وہ کس طرح ناکام ہوئے) اور اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ قرض کی مقدار بڑھنے سے رکی ہی نہیں بلکہ اس میں اضافہ اور کہیں زیادہ تیز رفتاری سے ہو رہا ہے۔

برطانوی حکومت کے زمانہ میں ہندوستان کے کسانوں کی قرض داری میں جو اضافہ ہوا ہے۔ اس کی تفصیلی تحقیقاتی رپورٹ ایم ایل ڈارلنگ کی کتاب "پنجاب کا کسان اور اس کی خوشحالی اور قرض داری" ملتی ہے یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں چھپی تھی، اس کی دو سمی دو انگریزی کتابوں "رسٹی کس لاکو سٹر" ۱۹۳۰ء اور "وسڈم اینڈ ویسٹ ان پنجاب ویلیج" ۱۹۳۴ء میں اور زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ مصنف کا رجحان اگرچہ یہ ہے کہ سامراج کی مدافعت کرے لیکن واقعات خود اصل حقیقت پیش کر دیتے ہیں، اپنی پہلی کتاب میں انہوں نے بتایا ہے کہ انگریزوں کے آنے کے بعد سے پنجاب میں قرضداری کس طرح بڑھی:

"زمین رہن رکھوانے کا طریقہ جو سکھوں کے زمانے میں شاذ ہی نظر

آتا تھا۔ اب ہر گاؤں میں عام ہو گیا ہے۔ ۱۸۷۸ء تک سارے صوبہ کا ۷ فیصدی رقبہ رہن ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۰ء میں زمین کے مالک کسان اور ساہوکار کی غیر مساوی لڑائی کا فیصلہ ہو گیا اور ساہوکار کو زبردست کامیابی ہوئی .... تیس سال تک ساہوکار اپنے انتہائی عروج پر رہا۔ اس نے اپنی دولت میں بے حد اضافہ کیا اور بہت مالدار اور خوش حال بن گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنکروں اور ساہوکاروں کی تعداد (ان کے لواحقین کو شامل کر کے) ۱۸۶۸ء میں ۵۳۲۳ اور ۱۹۱۱ء تک بڑھ کر ۱۹۳۸۹۰ ہو گئی۔"

(پنجاب کا کسان اس کی خوشحالی اور قرضداری : از : ڈارلنگ)

مسٹر ڈارلنگ کا یہ خیال تھا کہ ساہوکار ۱۹۱۱ء تک اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ اور ۱۹۲۷ء میں زرعی کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے انہوں نے یہ امید ظاہر کی: "پنجاب میں دیہاتی ساہوکار سوائے دو ضلعوں کے ہر جگہ اپنا کاروبار آہستہ آہستہ کم کر رہا ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ امداد باہمی کی تحریک نے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی ہے کسان قرض دار کی قانونی حفاظت کی گئی ہے اور ساہوکار پر قانونی پابندیاں لگائی گئی ہیں) (رپورٹ صفحہ ۴۴۲) لیکن پندرہی سال بعد جب انہوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنی کتاب "رسٹی کس لاکوئیٹر" شائع کی تو اس وقت تک اگرچہ اس کا لہجہ پُر امید رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اسے خطرہ کی گھنٹی بجانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ:

"انتقال زمین کے قانون کے باوجود اس کا خطرہ موجود ہے کہ کسانوں کے ہاتھ سے پھر بڑے پیمانے پر زمینیں نکلنے لگیں، مغربی پنجاب میں ابھی سے اس کی علامتیں ہیں اور یہاں بڑے جاگیردار اس قانون سے فائدہ اٹھا کر اس کوشش میں ہیں کہ کسانوں کی زمینیں اپنے قبضے میں کر لیں۔"

۱۹۳۵ء میں پنجاب کے مال افسر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

"دیہاتی علاقوں میں کسان ساہوکار طاقت حاصل کر رہے ہیں۔"

(پنجاب کے محکمہ مال کی انتظامی رپورٹ ۱۹۳۵ صفحہ ۶)

پنجاب میں مسٹر ڈارلنگ نے ۱۹۱۹ء میں جو تحقیقات کی تھی اس میں انہیں پتہ چلا تھا کہ صرف ۱۷ فیصدی زمین کے مالک ایسے تھے جو قرضہ سے بری تھے، اور اوسطاً قرضہ ۶۳۴ روپیہ تھا۔ یعنی مالگزاری کا بارہ گنا۔

یہ صورت حال تھی جس نے دیہات کے کسان دستکار، شہر کے چھوٹے دکان دار چھوٹے ملازم پیشہ اور بیروزگار نوجوانوں کو بغاوت کا پرچم بلند کرنے کے لیے اکسایا۔ چنانچہ یہی وہ لوگ تھے جو تحریک خلافت کے روح رواں بنے اور اسی نے پنجاب کے مسلمانوں کے نچلے درمیانے طبقے اور اوپری طبقے کے جذبات و احساسات اور ان کے اظہار کے طریقوں میں مختلف راہیں کھولدیں۔ نچلے درمیانے طبقے کے مختلف عناصر نے کھلم کھلا انگریز کے خلاف محاذ قائم کیا۔ کبھی اسنے ڈنڈا فوج بنائی اور کبھی اسنے ریل کی پٹڑی اکھاڑی اور کبھی انگریز کے بنک لوٹنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اس کے مقابلے میں بڑے زمیندار، بڑے بیرسٹر اور شہری معززین نے انگریز سے صلح اور آشتی کی راہ اختیار کی۔ یہ دراصل دو متحارب طبقوں کی متحارب پالیسیاں تھیں۔ چنانچہ پنجاب میں فضل حسین جیسا کانگرسی ہو یا سر شفیع جیسا مسلم لیگی، سبھی نے کھلی بغاوت کی راہ اختیار کرنے سے گریز کیا۔ ان کے اندرونی جذبات کچھ ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس وقت ہی، قوم پرست مسلمان اور مسلم لیگی مسلمان کی بنیاد پڑی۔ یہ دراصل کوئی سیاسی تفریق نہ تھی، بلکہ ایک طرح سے طبقاتی تفریق تھی، یہ نچلا درمیانہ طبقہ جو خلافت کا روح رواں تھا۔ اس کے لیے انگریز دشمن نمبر ایک ٹھہرا اس لیے وہ سب سے پہلے اس سے ٹکرانا اور اس سے گلو خلاصی چاہتا تھا اس لیے بھی کہ ان لوگوں نے اپنے تجربے سے سیکھا تھا کہ ان کی معاشی محرومی کا براہ راست ذمہ دار انگریز ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں بڑا زمیندار اور شہری معززیہ محسوس کرتا تھا۔ کہ انگریز کے ساتھ میں ہی وہ ہندو کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کو اور اس کے بھائی بیٹوں کو انگریز کی ملازمت میں مسابقت انگریز سے نہیں بلکہ ہندو سے پڑتی تھی۔ لہٰذا اس کے لیے دشمن نمبر ایک ہندو ٹھہرا اور دشمن نمبر ۲ انگریز قرار پایا۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو وہ انگریز کو اس وقت تک قائم دائم دیکھنا چاہتا تھا۔ جب تک کہ وہ ہندو کے برابر نہ ہو جائے۔ چنانچہ پنجاب کا پڑھا لکھا مسلمان جس کا مقدر سول سیکریٹریٹ کی ملازمت تھی۔ وہ اس زمانے میں ایک طرف

اگر علامہ اقبال کے شعروں سے جذبہ اور توانائی حاصل کرتا تھا تو دوسری طرف سر فضل حسین کی زندگی کے لیے دعائیں مانگتا تھا۔ کیونکہ وہ ملازمتوں میں مسلمانوں کے تحفظ کی لڑائی لڑ رہا تھا۔

اسی طبقاتی بُعد نے دونوں کو مختلف فلسفے اور مختلف طریق کار اپنانے پر مائل کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خلافت کمیٹی کے اندر بھی یہ احرار کا گروہ بحیثیت نچلے درمیانے طبقے کے نمایندوں کے مصروف جہد رہا۔ اور پہلے دن سے ہی اس گروہ کو اپنی غریبی پر ایک ناز رہا۔ خلافت کمیٹی کے اندر کی جدوجہد کا ذکر خود چودھری افضل حق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پنجاب خلافت کمیٹی جو مجلس مرکزیہ کے جسم کے لیے روح کا حکم رکھتی تھی، غیر ارادی و غیر شعوری طور سے اس کے اپنے اندر دو گروہ موجود تھے۔ خلافت پنجاب کا طبقۂ اعلےٰ یعنی حاکم گروہ اور تھا اور طبقۂ ادنےٰ یعنی حکم بردار گروہ اور ... حاکم گروہ رنڈی کے پوت اور سوداگر کے گھوڑے کی طرح کام چور اور آرام طلب تھا۔

طول و عرض ہند میں بھاگ دوڑ کا کام طبقۂ ادنےٰ کا کام تھا۔ طبقۂ اعلیٰ کو اپنے گروہ کے موجود ہونے کا علم تھا۔ لیکن طبقۂ ادنےٰ کو الگ احساس خودی نہ تھا۔ اس کا ہر فرد اپنے آپ کو کل کا جزو سمجھ کر مطمئن کام سرانجام دے رہا تھا۔ تاہم حکم بردار گروہ سے حاکم گروہ اندر ہی اندر خائف سا تھا۔ اور کچھ الگ الگ کھچا کھچا سا رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو امیر طبقے سے متعلق اور عقل کا سرمایہ دار سمجھتا تھا۔ اور گروہ ادنےٰ کو علم و سرمائے سے محروم قیاس کر کے چھوٹی موٹی خدمات سرانجام دینے کا اہل خیال کرتا تھا۔ جب مجلس خلافت پنجاب کا الحاق مرکز سے ٹوٹ گیا۔ تو اس اعلیٰ گروہ کے کام کرنے کی طاقتوں نے بالکل جواب دے دیا۔ وہ کلی طور پر کانگرس کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ ان کا قیاس تھا کہ مسلمان خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہے۔ طبقۂ ادنےٰ اپنی قوت عمل پر ساری قوم کا قیاس کر کے ہندوستانی مسلمان کو فوری انقلاب میں کامیاب نکلنے کا اہل سمجھتا تھا۔ لیکن یہ دونوں فریقوں کو بر بنائے تجربہ احساس تھا کہ ہندو اور مسلمان میں کوئی یگانگت موجود نہیں، ہندو کی چھوت چھات نے دو قوموں کے درمیان دیوار چن رکھی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں دونوں گروہ مل کر چھوت چھات

کے خلاف آواز بلند کر چکے تھے۔ اور جانتے تھے کہ ہندوؤں کی "مجھے نہ چھوؤ" کی پالیسی سے مسلمان ناقابلِ بیان حد تک بیزار ہے۔ کانگرس میں بعض پاکیزہ خیال اور نیک طبیعت لوگ تو ہیں۔ لیکن اکثر وہ ہیں جو پالٹکس میں بھی مجلسی تنگ نظری سے کام لے رہے ہیں اور اس لیے مجلسِ خلافت پنجاب کے اعلیٰ طبقے نے مسلم نیشنلسٹ پارٹی بنائی اور ادنےٰ طبقے نے مجلسِ احرار بنانے کا اعلان کیا۔ ان حالات میں بھی دونوں گروہوں کی تقسیم پوری واضح نہ ہوئی تھی بظاہر کوئی جھگڑا نہ تھا۔ غالب قیاس یہ تھا کہ نیشنلسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا۔ ڈاکٹر محمد عالم ہیں زیادہ دیر تک یہ گروہ قائم نہ رہے گا۔ چند میں یہ برائے نام جھگڑا مٹ جائے گا اور ایک نام کے ساتھ کام ہونے لگے گا۔" (تاریخ احرار ص۳۰)

اس مسلسل جد وجہد اور غریبی پر ناز نے ان کو ایک طرف رومانوی اشتراکی بنا دیا۔ دوسری طرف مذہب کے لیے بے پناہ محبت کا جذبہ بیدار کیا۔ اور ان دونوں جذبوں میں انہوں نے کبھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا یہی مذہبی یگانگت وجنون اور رومانوی اشتراکیت دوستی تھی، جس نے ان کو ایک طرف سامراج دشمن صفوں میں مستقلاً کھڑا رکھا۔ تو دوسری طرف ہر اس جماعت سے دور رکھا۔ جس پر اُمراء کا تسلط ہو، لیکن امراء کے تسلط سے نجات پانے کے لیے یہ ٹھوس اقتصادی لائحہ عمل نہ اپنا سکے چنانچہ اس گروہ میں یہ تضاد مجلس احرار کے قیام کے بعد اور پہلے دونوں صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ واقع ہے کہ مجلس احرار شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی پہلی اور آخری جماعت تھی، جس میں انقلابی رجحانات کی شدید آمیزش تھی، چنانچہ خود احرار کے زعماء جگہ جگہ اپنی انقلاب پسندی اور سرمایہ داری نظام کی مخالفت کا ذکر کرتے ہیں، چودھری افضل حق تاریخ احرار کے ابتدائیہ میں بھی لکھتے ہیں:

"فرشتہ خصلت غریب پر قیامت گزر جائے کوئی نہیں پوچھتا شیطان سیرت امیر کے سر درد کی خبر پا کر لوگ پیٹ پکڑے آتے ہیں اور گھر بیٹھے بھی پیر شہید مناتے ہیں، یہی حال سرمایہ دار اور غریب جماعتوں کا ہے۔ مجلس احرار قربانی کے کارناموں کی زندہ تاریخ ہے مگر مفلس کا ایثار سرمایہ دار دنیا میں بے توقیر ہے۔ سردیوں کی چاندنی رات اور جنگل کے شگفتہ پھول کی طرح اس پر نگاہ

ڈالنے کی کسی کو فرصت کہاں؟ لیکن جنگل کا پھول اور سردیوں کی چاندنی رات ذوقِ نظارہ کے لیے کم دعوت نہیں، مجلس احرار کو دنیا ہزار نظر انداز کرے۔ مگر اس کی جاذب تاریخ کو پڑھ کر ہر شخص مرحبا کہنے پر مجبور ہوگا۔ میں ایسی پریشان حالی میں اس کو لکھنے بیٹھا ہوں کہ مضمون کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکا۔ مصلحت وقت کے پیش نظر بعض حصے تشنۂ تکمیل ہیں۔ قانون کی تلوار گردن کے بہت قریب لٹک رہی ہے ایسے حال میں اسی تحفے کو دوست کی طرح قبول فرمائیں۔ بعض ضروری افراد اور احباب کا ذکر رہ گیا ہے۔ اور بعض واقعات نظر انداز ہو گئے ہیں۔ ذرا حالات پرسکون ہو لیں، تو شاید جماعت کا کوئی اور دوست یا خود میں ہی فرصت پاؤں تو کبھی تکمیل کی کوشش ہو جائے۔ جماعتی ریزولیشن بطور ضمیمہ شامل کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر کاغذ سونے کے تول بکنے لگا ہے۔ حجم بڑھ گیا تو اشاعت اور خرید دونوں مہنگے سودے ہوں گے۔"

تاریخ احرار صفحہ ۵۲۰

لیکن اس غریب نواز جماعت کے قیام کا دور بھی بہت اہمیت رکھتا ہے اور یہی وہ دور ہے جس میں ہندوستان میں جگہ جگہ انقلابی تحریکیں پروان چڑھنا شروع ہوئی تھیں، اور خود کانگرس کے اندر ایک نمایاں بایاں بازو ایک طرف ابھر رہا تھا تو دوسری طرف بائیں بازو کا ایک حصہ تشدد کی راہ اختیار کر رہا تھا اور یہی وہ زمانہ تھا جب کمیونزم کا بھوت برطانوی شہنشاہیت کو پریشان کر رہا تھا اور وہ ہندوستان میں اس کمیونزم کی روک تھام کے لیے لیس ہو رہی تھی۔ لیکن پیشتر اس کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔ ہماری تحریکوں کے انگریز دشمنی کے مذہبی پہلو پر بھی غور کیا جانا چاہیئے۔

اس انگریز دشمنی کی پشت پر ایک تاریخی جذبہ بھی کارفرما رہا ہے وہ جذبہ ہے اسلام اور عیسائیت کی کشمکش، دونوں ایک ہی خطے سے اٹھنے والے مذاہب ہیں۔ اور جب اسلام پھیلا تو اس وقت عیسائیت کا چاروں طرف تسلط تھا۔ چنانچہ اسلام کو اور اس کے نام لیواؤں کو سب سے پہلا مقابلہ جو کرنا پڑا وہ عیسائیوں سے ہی تھا۔ اور مسلسل کئی صدیوں تک سلطنتوں کی توسیع

کے لیے ایک طرف عیسائی بادشاہ ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، دوسری طرف مسلمان خلفا اور بادشاہ تھے۔ اس کشمکش نے مذہبی جنگوں کا روپ اختیار کیا۔ یہ تو تھی تاریخی کشمکش، لیکن ہندوستان میں بھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری شروع ہوئی تو جہاں انہوں نے اقتصادی لوٹ کھسوٹ شروع کی اور ہمارے ہاں کی معیشت کو تباہ کیا وہاں انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ کو بھی اپنی سلطنت اور عملداری کی وسعت کے لیے ذریعہ بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں انگریز سے نفرت عیسائیت کی بنیاد پر بھی ہونے لگی اور اس لوٹ کھسوٹ کی پشت پر اقتصادی اور سیاسی عوامل مذہبی نفرت میں گڈمڈ ہو گئے اور انگریز کی ہر چیز قابل نفرت ٹھہری۔ خواہ وہ زبان ہو لباس یا علم، نفرت کے یہ سوتے اسی نچلے درمیانے طبقے کو سیراب کرتے رہے اور اوپر کے طبقے نے اس کے بالکل الٹ انگریزی تعلیم کو اپنایا، انگریزی لباس پہنا اور انگریزی علم اور سائنس کو مفید جانا۔ چنانچہ اسی اوپری طبقے کی اولاد نے انگریزی تعلیم، اور انگریزی تہذیب سے استفادہ کر کے ملازمتیں حاصل کیں، چنانچہ ظاہر ہے کہ جب انگریزی شہنشاہیت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک ابھرے گی تو یہ اوپری طبقہ کے لوگ جن کے مفادات انگریزی حکومت سے وابستہ ہو گئے ہیں، وہ اس عدم تعاون کو کسی صورت میں برداشت نہیں کریں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کے اس نچلے درمیانے طبقے اور اوپر کے طبقوں میں ہر ہر قدم پہ تفاوت اور بُعد کا ایک سمندر حائل رہا۔ اس بُعد اور تفریق میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں رونما ہونے والے سوویت روس کے انقلاب نے بھی زبردست اضافہ کیا۔

عام طور پر سوویت روس کے انقلاب کی چھاپ جو ہماری تحریک پر پڑی اس کا پوری طرح تجزیہ نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس انقلاب نے دنیا بھر کی آزادی کی تحریکوں کو جو توانائی بخشی، ان کو تندرستی مہیا کی۔ اور خود اعتمادی کی شمعیں روشن کیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی اور برطانوی سامراج کے خلاف تحریک میں سوویت روس کے انقلاب کا زبردست حصہ ہے اور جب پہلی جنگ عظیم کے بارے میں لینن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا تو بہت سے دانشوروں کے ماتھوں پر شکنیں پڑ گئیں، انہوں نے اس جنگ کو مختصر اور جامع الفاظ میں مال غنیمت کی تقسیم کے لیے "لٹیروں کی جنگ" کا نام دیا تھا۔ یہ واقعہ ہے

کہ یہ جنگ دو سامراجی گروہوں کی شدید رقابت کا نتیجہ تھی۔ جن میں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ نو آبادیوں، حلقہ اثر اور عارضی مقبوضات وغیرہ کا بھی نئے سرے سے بٹوارہ ہو۔ جو ظالموں کے توازن کی تبدیلی سے مطابقت رکھتا ہو۔ چنانچہ ہندوستان کے اندر اور باہر پہلی جنگ عظیم کے خلاف جو مزاحمتی تحریکیں ابھریں ان کے ڈانڈے بالآخر کسی نہ کسی طرح سے سوویت روس کے انقلاب سے جا کر ملے۔ خواہ یہ امریکہ میں قائم ہونے والی غدر پارٹی ہو یا شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی رہنمائی میں کام کرنے والی عارضی حکومت ہو، جو کابل میں قائم ہوئی ان سب نے سوویت روس کے انقلاب سے ولولہ ہی حاصل نہیں کیا۔ بلکہ سوویت روس کے انقلابیوں سے گہرے رشتے بھی استوار کئے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ سوویت روس انقلاب نے ہماری تحریکوں کا ایک معتدبہ حصہ متاثر کیا۔ ۱۹۱۷ء میں سوویت انقلاب نے زار شاہی کو جب شکست دی تو اس سے تمام سامراجی طاقتیں بوکھلا گئیں اور اس انقلاب کے پانچ ماہ بعد ہی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کر دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت ابھی تحریک نے شدت اختیار نہیں کی تھی۔ ان اصلاحات کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندوستان کے اوپری طبقوں کو ان اصلاحات کے فریب میں الجھا کر تحریک کو ابھرنے نہ دیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود جو عمل سوویت روس کی سرزمین پر جاری و ساری ہوا اس نے ایک عالم کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسی کے متعلق لینن نے کہا تھا:

"یہ بات روس کے حصے میں آئی ہے کہ وہ تاریخ کے انتہائی پیچیدہ موڑوں کا ایسے وقت میں صاف صاف مشاہدہ کرے اور انتہائی گہرائی اور مشقت سے ان کا تجربہ حاصل کرے جبکہ تاریخ سامراج سے کمیونسٹ انقلاب کی طرف مڑ رہی ہے۔ ہم نے چند دنوں کے اندر ایک قدیم ترین، انتہائی طاقتور، وحشی اور ظالم بادشاہت کو تباہ کر دیا۔ چند مہینوں کے اندر ہم بورژوازی کے ساتھ سمجھوتے کی متعدد منزلیں اور پیٹی بورژوا داہموں کو دور کرنے کی ایسی منزلوں سے گذر گئے جن کے لیے دوسرے ملکوں کو دسیوں برسوں کی ضرورت ہوئی۔ چند ہفتوں میں، بورژوازی کا تختہ الٹنے کے بعد ہم نے خانہ جنگی میں اس کی کھلی مزاحمت کو کچل دیا۔ ہم وسیع ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بالشیوزم کی فاتحانہ شاندار

پیش قدمی کے ساتھ گزرے۔ ہم نے زار شاہی اور پورژوازی کے جبر و تشدد کے شکار محنت کش عوام کے سب سے نیچے والے پرتوں کو نجات اور آزادی کی زندگی تک بلند کر دیا۔ ہم نے ایک نئی قسم کی ریاست "سوویت ری پبلک" قائم کی اور اس کو مضبوط بنایا جو بہترین بورژوا پارلیمانی ریپبلکوں سے بے حد برتر اور زیادہ جمہوری ہے۔ ہم نے پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ قائم کی جس کی حمایت غریب ترین کسان کر رہے تھے اور سوشلسٹ اصلاح کا وسیع پیمانے پر مرتب کیا ہوا نظام شروع کیا ہم نے تمام ملکوں کے لاکھوں کروڑوں مزدوروں میں اپنی طاقت پر اعتماد کا جذبہ بیدار کیا۔ اور ولولے کی آگ بھڑکا دی، ہر جگہ ہم نے عالمی مزدوروں کے انقلاب کی اپیل جاری کی۔ ہم نے تمام ملکوں کے سامراجی لٹیروں کو للکارا۔"

(لینن، اکتوبر انقلاب کی سالگرہوں کے
موقع پر مضامین اور تقریریں صفحہ ۲)

صرف یہی نہیں بلکہ ۲۰ مئی ۱۹۲۰ء میں جب ہندوستان میں عوامی تحریک نئی بلندیوں اور رفعتوں کو چھو رہی تھی؛ اس وقت ہندوستان کے انقلابیوں کے نام سوویت انقلاب کے قائد لینن نے پیغام بھیجا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا:

"مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ مظلوم و مجبور قوموں کی دیسی اور بدیسی سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال سے آزادی اور خود اختیاری کے اصولوں نے جن کا مزدوروں اور کسانوں کی ری پبلک نے اعلان کیا تھا؛ ترقی پسند ہندوستانیوں کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔ جو خود آزادی کے لیے اس قدر جانفروشی سے لڑ رہے ہیں۔ روس کے محنت کش عوام ہندوستان کے مزدور اور کسان کی بیداری اور جاگرتی کو برابر انتہائی غور اور توجہ سے دیکھتے ہیں۔ محنت کشوں کی تنظیم، ان کا ڈسپلن اور ضبط و استقلال اور تمام دنیا کے محنت کشوں کے ساتھ ان کی ہمدردی اور یگانگت۔ یہ سب چیزیں ایک اہم جیت کی ضمانت ہیں، ہم مسلم اور غیر مسلم عناصر کے پکے اتحاد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم خلوص دل سے

اس بات کے خواہش مند ہیں کہ یہ اتحاد بڑھ کر مشرق کے تمام محنت کشوں کو اپنی آغوش میں لے لے۔ کیونکہ جب ہندوستانی، چینی، کوریائی، جاپانی، ایرانی، اور ترکی مزدور اور کسان ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر آزادی کے مشترکہ آدرش کی راہ پر گامزن ہوں گے۔ صرف اسی وقت استحصال کرنے والوں کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح یقینی ہو سکتی ہے۔ آزاد ایشیا زندہ باد!"

(اقوام مشرق کی تحریک آزادی صفحہ ۳۶۷)

سوویت انقلاب نے مسلم عوام کو ایک اور طرح سے بھی متاثر کیا۔ کیونکہ سوویت روس نے ایران اور ترکی کے خلاف زار روس کے تمام خفیہ معاہدوں، جن کی رُو سے ان دونوں ممالک کے علاقوں کو ہتھیایا گیا تھا، کالعدم قرار دے دیئے تھے۔ پھر افغانستان میں غازی امان اللہ خاں کی نئی حکومت کے ساتھ سوویت روس نے گہرے تعلقات قائم کیے۔ چنانچہ لینن نے انقلاب کی کامیابی کے فوراً بعد غازی امان اللہ کو ایک مکتوب ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا:

"افغانستان نے ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے جو پہلا مراسلہ بھیجا ہے۔ جس میں روسی قوم کو پیام تہنیت بھیجا گیا ہے اور عالیجاہ کی تخت نشینی کی اطلاع دی گئی ہے اس کے جواب میں ہم فوراً مزدوروں اور کسانوں کی حکومت اور پوری روسی قوم کی طرف سے آزاد اور خود مختار افغانی قوم کی خدمت میں پیام تہنیت بھیجتے ہیں، جو اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے غیر ملکی ظلم و زبردستی کے خلاف اس قدر بے جگری سے لڑی ہے۔ عالی جاہ ہم آپ کی تخت نشینی پر آپ کو مبارکباد پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جو ۲۱ فروری ۱۹۱۹ء کو عمل میں آئی۔

مزدوروں اور کسانوں کی حکومت نے روسی ریپبلک کی تمام قومیتوں کو سبھی آزادی اور مساوات عطا کر دی ہے اور اپنے اعلانات سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتے ہوئے لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے خلاف تمام محنت کشوں کی ایکتا کے بین الاقوامی اصول پر مضبوطی سے کاربند ہو گئی ہے۔

ہماری دعا ہے کہ افغانی قوم کی روسی کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش

افغانی ریاست کی مضبوطی اور خود مختاری کی بہترین ضمانت ثابت ہو۔

ہم عالی جاہ کے روسی قوم کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنے کے ارادہ کا سواگت کرتے ہیں، اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ماسکو میں اپنے ایک سرکاری نمائندہ کا تقرر کر دیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کے ایک نمائندہ کا کابل میں تقرر کرنے کو تیار ہیں۔ اور درخواست کرتے ہیں کہ عالی جاہ متعلقہ افسران کو حکم دے دیں کہ وہ ہمارے نمائندے کے سفر میں سہولت پیدا کریں۔ ہماری دو عظیم قوموں کے درمیان مستقل سفارتی تعلقات کا قیام اس بات کے بھرپور امکانات پیدا کریگا۔ کہ ہمارے ملکوں کی آزادی پر کسی لٹیری اور سفاک بدیسی قوت کی دست درازی کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کی جا سکے۔

میں افغانی قوم کے نام یہ پہلا پیام تہنیت بھیجتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرتا ہوں۔ اور عالی جاہ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی قوم کے دوستوں کا سلام محبت قبول کریں۔

ماسکو ۲۷ مئی ۱۹۱۹ء

لینن

(اقوام مشرق کی تحریک آزادی صفحہ ۳۲۹)

پھر لینن نے ایک امریکی اخبار نویس کے سوالوں کے جواب میں کہا تھا۔

"ہماری سوویت ری پبلک ہندوستان، افغانستان اور روس سے باہر کے دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی وہی کچھ کرتی ہے جو وہ خود روس میں رہنے والے بے شمار مسلمانوں اور دوسری غیر روسی قومیتوں کے ساتھ کرتی ہے مثال کے طور پر ہم نے بشکیریا کے عوام کو روس کے اندر اپنی ایک خود مختار ری پبلک قائم کرنے کے قابل بنا دیا۔ ہم ہر قومیت کی خود مختاری اور آزاد ارتقا میں اور مختلف دیسی زبانوں میں ادب کے پھلنے پھولنے پڑھنے اور پھیلنے میں ہر ممکن طریقے سے مدد کر رہے ہیں۔ ہم اپنے سوویت دستور اساسی کا

ترجمہ کر رہے ہیں، اور اسے مقبول عام بنا رہے ہیں اور یہ وہ دستور اساسی ہے جو بدقسمتی سے نوآبادیات کے اور ساری دست نگر، مظلوم و مجبور اور غیر مساوی قوموں کے ایک کھرب لوگوں کے لیے بورژوا "جمہوری" ملکوں کے "مغربی یورپی" یا امریکی قسم کے دستورہائے اساسی سے زیادہ کشش اور جاذبیت رکھتا ہے کیونکہ اس قسم کے دستورہائے اساسی تو اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ زمین اور سرمائے کی شخصی ملکیت کو استوار اور مستحکم کریں۔ یعنی خود اپنے ملکوں کے مزدوروں کو دبانے اور کچلنے کو اور افریقہ، ایشیا وغیرہ کی نوآبادیوں کے کروڑوں باسیوں کو دبانے اور ستانے میں اور زیادہ شدت اور تیزی پیدا کرنے میں مٹھی بھر "سرمایہ داروں کی مدد کریں۔"

(اقوام مشرق کی تحریک آزادی صفحہ ۳۳۱)

ان تمام واقعات نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اسی زمانے سے برطانوی شہنشاہیت نے اپنے زیر اثر مذہبی رہنماؤں کے ذریعے سوویت روس کے خلاف زبردست مہم کا اجرا کیا تھا اور کمیونزم کو الحاد اور کفر کہہ کر عام مسلمانوں کو ڈرانے اور بہکانے کی کوشش کی جاتی رہی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں تمام پروپیگنڈے کے باوجود عوام کوئی زیادہ متاثر نہیں ہوتے تھے؛ امرا کا طبقہ یقینی طور پر متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ اس زمانے میں سوویت انقلاب کی حمایت میں خیالات اور رجحانات کا اظہار دیکھنے میں آتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے تو کھلم کھلا اپنے کو مسلم کمیونسٹ کہلایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" میں کمیونسٹ مینی فیسٹو کا ترجمہ شائع ہوا۔ اور ترجمان القرآن میں "سوشلزم کو بہرحال تجربے کا موقع ملنا چاہیئے" کا کھلے بندوں اظہار ہوا۔ خود احرار کے گروہ نے جگہ جگہ مزدوروں اور کسانوں کی بھلائی کا اعلان کیا۔ چنانچہ مجلس احرار کے باقاعدہ قیام کے موقع پر ۱۹۳۱ء میں مولانا مظہر علی اظہر کا خطبۂ استقبالیہ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا خطبۂ صدارت احرار کے عزائم کی نشاندہی کرتے ہیں، ۱۹۳۱ء میں مولانا مظہر علی اظہر نے کہا تھا،

"ہندوستان کے مدعیان قوم پرستی کو ابھی تک یہ سبق پڑھائے جانے کی ضرورت ہے کہ" دنیا امیروں کی جولانگاہ نہیں، اس میں غریبوں کا بھی حصہ ہے" بلکہ اگر حق رائے دہی اور نظام حکومت کی ضرورت ہے تو غریبوں کو، امیر تو خود اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اپنے لیے حفظان صحت کا انتظام کر سکتے ہیں۔ جائداد کی حفاظت کے لیے پہرہ دار مقرر کر سکتے ہیں۔ اپنی اولاد کو تعلیم دے سکتے ہیں۔ لیکن غریب ہی ہیں جنہیں نہ آج تک تعلیم دی گئی نہ ان کے لیے حفظانِ صحت کا بندوبست کیا گیا نہ ان کی روزمرہ زندگی ہی انسانوں کی زندگی کہلا سکتی ہے بلکہ امیروں کے اکثر کتے لاکھوں اور کروڑوں غریب انسانوں سے بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اگر اسی نظام حکومت کو قائم رکھنا ہے جو سرمایہ داری کی شان اپنے اندر رکھتا ہے اور غریب کو کچل کچل کر امیر کو مالامال کرنے میں منہمک ہے تو برطانوی کارتوس اور بم کچھ عرصہ تک یقیناً ابھی غریبوں کو خاموش رکھ سکیں گے اور ہندو اور سکھ سرمایہ پرستی اسی امید پر ادھار کھائے بیٹھی ہے مگر نوع انسانی کے غریب لیکن محنت کش افراد ہمیشہ کے لیے قعرِ مذلت میں نہیں رہ سکتے۔ اگر پنجاب میں غریب طبقہ میں مسلمانوں کی نمائندگی زیادہ ہے تو باقی صوبوں میں غریب ہندوؤں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ قوم کے بہترین افراد کو جو شب و روز محنت کرتے ہیں اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے بھی اکثر محروم رکھے جاتے ہیں۔ جنہیں نہ گرمی میں شملہ، ڈلہوزی اور مری کی ٹھنڈی ہوائیں نصیب ہوتی ہیں نہ سردی میں دہکتی ہوئی انگیٹھیوں کے آگے بیٹھنا مل سکتا ہے۔ نہ بادوباراں کے موسم میں ہی کہیں سر چھپا کر بیٹھنے کی ہی توفیق ہوتی ہے۔ انہیں ہمیشہ اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنا انہیں شرف انسانیت سے محروم رکھنا، احسن تقویم میں خلق کی ہوئی دنیا کو اسفل سافلین میں رہنے پر مجبور کرنا بالآخر آجکل کے سرمایہ دار اور فوقیت یافتہ طبقہ کے لیے ہی نہ صرف خطرناک بلکہ مہلک ثابت ہوگا۔ آج وقت ہے کہ قوم کے ہر طبقہ کو فراخ حوصلگی سے مواقع ترقی دیئے جائیں۔ غریبوں، کمزوروں جاہلوں، بلکہ گناہ گاروں کی خبر گیری کی جائے۔ تاکہ وہ آسانی سے خواص انسانی حاصل کر سکے اور وطن کے لیے زینت اور فخر کا باعث ہوں۔ لیکن اگر حکومت کی مشینری اس لیے چلائی جاتی

ہے کہ غریب محنت کرے اور سرمایہ دار عیش اڑائے، مقروض کمائے اور قارض سب کچھ سود میں اڑا لے جائے۔ عوام الناس بیکاریوں، اور جرم و گناہ کی زندگی بسر کریں اور امراء رؤسا انہیں سزا دینا ہی اپنا فرض سمجھیں، ان کی مشکلات کو حل کرنے کی دردسری اپنے ذمہ نہ لیں تو طبقاتی جنگ کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا۔

ہم اب بھی آزادیٔ وطن کے لیے تہ دل سے کوشش کریں گے۔ لیکن ہماری کوششیں غریبوں، مفلسوں، محنت کشوں، مظلوموں اور ستم رسیدوں کی آزادی و خوشحالی اور فارغ البالی کے لیے ہوں گی ہم نئی بادشاہتیں، نئے راج، نئی نوابیاں اور نئے ساہوکارے دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتے ہم خود دولت اور امیری کے دلدادہ نہیں، نہ آئندہ امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنا ہمارا مقصد ہے اس لیے جہاں ہم نے آج تک برطانوی ملوکیت اور سرمایہ داری کا ساتھ دینا ضعف ایمانی سمجھا ہے اسی طرح ہندوستانی سرمایہ داری کے ہاتھ میں کھیلنا بھی ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ اگر ہمارے سرمایہ دار بھائی ہمیں اپنے پھندے میں نہ پھنستا دیکھ کر جوش غضب میں آئیں تو ہم مردانہ وار مسکرا کر اپنی راہ چلتے جائیں گے۔"

اسی موقع پر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں اعلان کیا تھا

"میرے نزدیک ہندوستان کی تمام مشکلات کا حل صرف ایک ہے کہ ہندوستان کے تمام سمجھ دار قوم پرست، کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم کریں اور ہندوستان میں بجائے ایک سرمایہ دار حکومت کے غربا کی حکومت قائم کریں، میں اگرچہ کانگرسی ہوں اور میں نے ہمیشہ کانگرس کے جھنڈے تلے کام کیا ہے۔ مگر مجھے اس کے کہنے میں پس و پیش نہیں ہے کہ کانگریس کی محنت اور قربانی کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی حکومت انگریزی سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔ بلکہ ڈومینین سٹیٹس کی شکل میں تو جو حکومت ہندوستان پر قائم ہوگی اس میں ہندوستانی اور انگریز سرمایہ دار مل کر یہاں کے غربا کو کچلنے کی کوشش کریں گے۔" (تاریخ احرار صفحہ ۵۵، ۵۶)

احرار زعماء کی تقریروں اور خطبوں میں مزدور، کسان دوستی کے جذبات اکثر و بیشتر خون گرماتے ہیں، ان کی شعلہ بیانیاں کاخِ امرا کو خس و خاشاک کرنے کے لیے ہر لمحہ بے تاب نظر آتی ہیں، یہ تقریریں، یہ خطبے، یہ غربت پر فخر، یہ غریبوں کی حمایت کی دہائی ایک طرف جہاں ان کے اپنے طبقے کی محرومیوں اور ان کی تلخیوں کا اظہار ہیں وہاں یہ شعلہ بیانیاں اردگرد کے حالات، معاشی بحران، اور عوامی اضطراب کا بھی اظہار ہیں، اس لیے کہ جب مجلس احرار قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں عوامی اضطراب ایک نئی منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ اور کانگرس و خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد سات آٹھ برس تک مایوسی کے جو بادل چھائے رہے تھے وہ قدرے چھٹنے شروع ہو گئے تھے، اور گاندھی جی کی گو گو اور سودے بازی کی پالیسی کے خلاف ایک نیا پُرجوش انقلابی نوجوانوں کا گروہ ابھرنے لگا تھا۔ اور ساتھ ہی ہندوستان کے اندر اور باہر کے معاشی بحران میں مزدوروں کو اپنے کو منظم کرنے اور ہڑتالیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور پھر سے حالات اسی نہج پر پہنچنے والے تھے، جہاں ۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء میں پہنچے تھے، اور جہاں عوامی جوش و خروش کا گاندھی جی نے گلا گھونٹ دیا تھا۔

یہ ہمارے ہاں کی تحریکوں کا ایک خاص پہلو رہا ہے کہ جب تحریکیں عوامی بننے لگتی ہیں اور ان میں مزدوروں، کسانوں اور پسے ہوئے کچلے ہوئے طبقوں کی محرومیوں اور تلخیوں کا ٹھوس طریقے سے ازالہ کی راہیں نکلنی شروع ہونے لگتی ہیں۔ جب ان مقہور و مجبور طبقات کی خواہشوں، آرزوؤں اور تمناؤں کو صحیح طریقے سے متشکل کیا جانے لگتا ہے تو قیادت جو اوپری طبقے کی یا ان کے مفاد کی حامی و مددگار ہوتی ہے وہ جھٹ سے تحریک کا گلا گھونٹ دیتی ہے کبھی یہ کام گاندھی جی چورا چوری کے نام پر کرتے رہے ہیں، کبھی گول میز کانفرنس میں شرکت کے نام پر تحریک ختم کر دی جاتی ہے۔ اور عوام کے اضطراب کو اس طرح سے انقلاب کی راہ پر آگے بڑھنے سے روک دیا جاتا ہے۔ چنانچہ احرار کے گروہ کو کانگریس سے ہمیشہ اس کی سمجھوتے بازی پر اعتراض رہا ہے۔ گاندھی جی کی سمجھوتہ بازی اور تحریک کو دبانے کا ذرا واضح نقشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ ان طریقوں کے جاننے سے عبرت ہوتی ہے کہ کس طرح یہ اوپری طبقہ عوام کو فریب دیتا ہے، چنانچہ پام دت، اپنی معرکۃ الآرا کتاب "نیا ہندوستان" میں لکھتے ہیں۔

"ایسے زمانہ میں جبکہ سارے ملک میں اتنا جوش و خروش تھا لوگوں کو اپنی کامیابی کی اتنی امید اور اس پر اتنا یقین تھا، کانگریس کے اندر ایک آدمی بہت رنجیدہ اور وہ حالات کے رخ سے پریشان تھا۔ یہ شخص گاندھی تھا۔ یہ تحریک جس کا خاکہ اس نے بنایا تھا۔ اس راہ پر بالکل نہیں جا رہی تھی۔ جس پر وہ اسے لے جانا چاہتا تھا۔ کہیں کچھ گڑبڑ تھی، یہ دیسی آئڈیل فلسفیانہ "عدم تشدد" کی تحریک نہیں تھی، جس کی تصویر اس کے ذہن میں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے تباہی کے دیو کو بے لگام کر دیا ہے۔ نابکار لوگ اس میں داخل ہو رہے تھے، بعض شوریدہ سر خاص طور پر بعض مسلمان ساتھی اس حد تک مطالبہ کرنے لگے تھے کہ "عدم تشدد" کی دفعہ ہی اڑا دی جائے۔ ۱۹۲۱ء کے ان آخری ہفتوں میں جبکہ ہزاروں مجاہد "گاندھی جی کی جے" کے نعروں کے ساتھ جیل جا رہے تھے۔ گاندھی جی کی پریشانی اور بیزاری روز بروز بڑھ رہی تھی جس کا بہت کچھ اندازہ ان کے اس مشہور فقرہ سے ہو جاتا ہے کہ "مجھے سوراج سے بُو آنے لگی ہے"۔

یوں تو احمد آباد سے ہی قدم پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے لیکن ابھی تک کھلے بندوں نہیں، اس لیے کہ آنے والے معرکہ کی توقع سے فضا میں بڑا ہیجان تھا اور ہزاروں آدمیوں کی آرزوئیں اس کے ساتھ تھیں، لیکن اس پس قدمی کے چھوٹے چھوٹے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ احمد آباد کانگریس خود ایک اس کا بہترین تاریخی موقعہ تھا کہ یہاں سے سارے ملک کو آواز دی جاتی کہ آؤ اور اجتماعی جدوجہد میں شریک ہو۔ نوخیز کمیونسٹ پارٹی نے احمد آباد کانگریس کے وقت جو مینی فسٹو شائع کیا تھا اس میں کہا گیا تھا:

"انقلاب سے ہندوستان کی بنیادیں ہل رہی ہیں، اور اگر کانگرس اس کی رہنمائی کرنا چاہتی ہے تو اسے صرف مظاہروں اور عارضی جوش و خروش پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے اسے چاہیئے کہ مزدور سبھاؤں کے مطالبات کو فوراً اپنے مطالبات بنا لے۔ اسے چاہیئے کہ کسان سبھاؤں کا جو پروگرام ہے اسے اپنا پروگرام بنا لے اور بہت جلد اس کا وقت آ جائے گا۔ کہ کوئی بھی رکاوٹ کانگرس کا راستہ نہیں روک سکے گی اس کے ساتھ ان عوام کی ناقابلِ مزاحمت قوت ہو گی جو پوری بیداری

کے ساتھ اپنے مادی مفاد کے لیے لڑ رہے ہوں گے۔"

(کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو جو ۱۹۲۱ء کی احمد آباد کی نیشنل کانگرس کے نام جاری کیا گیا تھا۔)

لیکن احمد آباد میں جدوجہد شروع کرنے کی اپیل نہیں کی گئی بلکہ اس کے برعکس ان لوگوں نے جو قریب سے مطالعہ کر رہے تھے، یہ محسوس کیا کہ پچھلی قراردادوں میں عدم ادائی ٹیکس کا جو ذکر آتا تھا۔ احمد آباد کی قرارداد سے وہ بھی غائب تھا۔ اجتماعی سول نافرمانی کا جہاں ذکر کیا بھی گیا تھا۔ وہاں بہت سے اگر مگر لگا دیئے گئے تھے، "مثلاً" کافی احتیاطی تدبیریں اختیار کرنے کے بعد"۔ "ان ہدایتوں کے مطابق جو بعد میں دی جائیں گی"۔ "جب لوگوں کی بڑی اکثریت کو عدم تشدد کے طریقے کی کافی تعلیم دی جا چکے گی"۔ وغیرہ، اس کے بعد اسی کانگرس میں جمہوریت پسند مسلمان لیڈر مولانا حسرت موہانی والا واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک قرارداد پیش کرنا چاہتے تھے۔ جس میں وہ سوراج کی تعریف "مکمل آزادی اور ہر قسم کے بیرونی اقتدار کا خاتمہ" کرنا چاہتے تھے گاندھی جی نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا "مجھے اس کا بڑا دکھ ہے اس لیے کہ اس سے بڑی غیر ذمہ داری کا اظہار ہوتا ہے"۔ اور انہوں نے اپنی کوشش سے اسے رد کروا دیا۔

حکومت ہند بڑی پریشانی کے ساتھ احمد آباد کانگریس اجلاس کا مطالعہ کر رہی تھی اور جب اسے پیچھے ہٹنے کے یہ ابتدائی آثار نظر آئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وائسرائے نے وزیر ہند کو تار کے ذریعہ اطلاع بھیجی:۔

"کرسمس کے زمانہ میں کانگریس نے اپنا سالانہ اجلاس احمد آباد میں منعقد کیا۔ بمبئی کے فساد کا گاندھی پر بڑا گہرا اثر ہوا جیسا کہ ان کے اس وقت کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ اس فساد نے ان پر روشن کر دیا کہ اجتماعی سول نافرمانی میں کتنے خطرات پوشیدہ ہیں۔ کانگریس کی قراردادوں سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہ وہاں نہ صرف خلافت پارٹی کے انتہا پسندوں کی یہ تجویز رد کر دی گئی کہ عدم تشدد کی پالیسی ترک کر دی جائے۔ بلکہ یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ سول نافرمانی کی تحریک اس وقت شروع کی جائے جبکہ وہ شرائط پوری

ہوں۔ جو دہلی کے اجلاس میں عائد کی گیئں تھیں۔ ساتھ ہی ان قرار دادوں میں سے عدم ادائی ٹیکس کا ذکر ہی اڑا دیا گیا:

{ ہندوستان کے بارے میں خط وکتابت
سی۔ایم۔ڈی ۱۵۸۶ سنہ ۱۹۲۲ء }

اب سوال یہ تھا کہ گاندھی جی کریں گے کیا؛ احمد آباد کانگریس تو بغیر کوئی منصوبہ بنائے ختم ہو چکی تھی، ہر چیز گاندھی جی کے ہاتھ میں چھوڑ دی گئی تھی، ہندوستانی عوام کے سر پر سامراجی تشدد کا ہتھوڑا چل رہا تھا اور وہ گاندھی جی کی طرف آنکھ لگائے بیٹھے تھے کہ وہ اس سے نکلنے کا کوئی منصوبہ پیش کریں گے۔ گاندھی جی کا طرز عمل عجیب وغریب تھا۔ وہ ایک مہینہ تک انتظار کرتے رہے اس عرصہ میں مختلف ضلعوں کے کانگرسی ان کے پاس آتے رہے اور ان سے درخواست کرتے رہے کہ عدم ادائی ٹیکس کی تحریک شروع کریں۔ مدراس کے ایک ضلع گنتور نے ان کی منظوری کے بغیر ہی تحریک شروع کردی۔ گاندھی جی نے کانگرسی عہدیداروں کو فوراً یہ پیام بھیجا کہ مقررہ تاریخ پر سارے ٹیکس ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک بہت چھوٹے سے ضلع میں یہ تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا جہاں انہوں نے اس کا خاص طور پر بندوبست کر لیا کہ کسی قسم کا کوئی تشدد نہ ہونے پائے۔ یہ ضلع بردولی تھا جو گجرات میں واقع ہے اس کی آبادی ۸۷ ہزار تھی۔ یعنی ہندوستان کی کل آبادی کا چار ہزارواں حصہ، لیکن ہندوستان کے سب لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے کہ ان کے لیڈر کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ پہلی فروری کو انہوں نے وائسرائے کو الٹی میٹم دیا، جس میں کہا کہ اگر تمام قیدی چھوڑ نہ دیئے گئے اور ظلم وتشدد بند نہ ہوا تو صرف بردولی میں اجتماعی سول نافرمانی شروع کردی جائے گی۔ ابھی یہ ہوا ہی تھا کہ چند ہی دن کے اندر یوپی کے ایک چھوٹے سے دیہات چورا چوری سے یہ خبر آئی کہ وہاں کے کسانوں نے غصہ میں آکر دیہات کے پولیس تھانہ پر دھاوا بول دیا۔ اسے جلا دیا اور اس میں ۲۲ پولیس کے سپاہی مارے گئے۔ جب گاندھی جی کو یہ خبر ملی کہ کسانوں میں بے چینی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے تو انہوں نے طے کر لیا کہ وقت بالکل ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ۱۲ فروری کو

بردولی میں جلد ہی ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ کیا گیا اور وہاں "چوراچوری میں مجمع کے غیر انسانی برتاؤ" کی وجہ سے یہ طے کیا گیا کہ نہ صرف اجتماعی سول نافرمانی کی تحریک روک دی جائے بلکہ والنیٹروں کے جلوسوں اور مخالفت کے باوجود جلسے کرکے سول نافرمانی کے لیے جو پرچار کیا جاتا تھا وہ بھی بند کر دیا جائے اور اس کی جگہ سوت کاتنے، نشہ بندی کرنے اور تعلیمی سرگرمیوں کا "تعمیری" پروگرام منظور کیا گیا، گویا یہ جنگ ختم ہوگئی ساری تحریک کا صفایا کر دیا گیا۔

(نیا ہندوستان صفحہ ۵۱۴)۔

گاندھی جی اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے انہوں نے تحریک کو دبا دیا عوام کے انقلابی جذبے کو سرد کر دیا لیکن ساتھ ہی پورے ملک کو مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا۔ جو انقلابی جذبے ہندو مسلم ایکتا اور اتحاد کے نعرے لگا کر برطانوی شہنشاہیت پر یلغار کر رہے تھے، وہ ہندو مسلم فسادات کے شعلوں کی نذر ہونے لگے، چاروں طرف مایوسی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا بڑھنے لگا اور اس اندھیری کی پرچھائیاں خود گاندھی جی پر پڑنے لگیں اور وہ چیخ اٹھے، چنانچہ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں خود اعتراف کیا کہ کہاں تو کانگریس کی رکنیت کو دس لاکھ تک پہنچانے کے دعوے تھے، اور کہاں اب ۲ لاکھ بھی مشکل سے ہوں گے"۔ "ہم سیاستداں حکومت کی مخالفت کے علاوہ عوام کی نمائندگی نہیں کرتے"۔ اس سال گاندھی جی نے کانگریس کی ممبری کی شرط یہ رکھوائی کہ ہر ممبر ماہانہ کم از کم ۲ ہزار گز سوت کاتے، نتیجہ کیا ہوا کہ ۱۹۲۵ء میں ممبروں کی تعداد گھٹ کر دس ہزار رہ گئی۔ اس کے بعد یہ شرط اڑا دی گئی۔

یہ سب کیوں ہوا؟ اس لیے کہ ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ عوامی تحریک کو صرف ایک حد تک لے جانا چاہتا تھا۔ یہ حد تھی، جہاں تک وہ برطانوی شہنشاہیت کو مراعات دینے پر مجبور نہ کر دے۔ اس سے آگے اس کو تحریک سے خود بھی خوف آتا تھا۔ کیونکہ پھر یہ تحریک خود اس نظام کو الٹنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے جس نظام نے اس طبقے کو صنعتکار بنایا ہے، تاجر بنایا ہے، زمیندار بنایا ہے، کوٹھیوں اور آسائشوں کا اجارہ دار ٹھہرایا ہے۔ لیکن سرمایہ دار یہ فراموش کر دیتا ہے کہ سامراج وقتی طور پر مراعات دے دیتا ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد وہ ان سے زیادہ وصول کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتا ہے۔

یہی ہندوستانی سرمایہ دار جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے خالصتاً ہندو مت کا پیرو تھا۔ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء میں پریشان ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ پچھلے چند سالوں میں ہندوستانی سرمایہ داروں کو جو بعض معاشی رعائتیں دی گئی تھیں وہ چھین لی گئیں اور اپنا معاشی اقتدار پھر سے قائم کرنے کے لئے بھرپور وار کیا گیا۔ ۱۹۲۷ء میں کرنسی بل (ہندوستانیوں کی سخت مخالفت کے باوجود) پاس کر دیا گیا۔ اور روپیہ کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس کر دی گئی۔ فولاد کی صنعت کا حفاظتی بل پاس کیا گیا جس کی رو سے برطانوی فولاد کی صنعت کو رعائتیں دی گئیں اور ۱۹۲۴ء میں ہندوستانی صنعت کی حفاظت کے لیے جو قانون بنے تھے وہ کالعدم کر دیئے گئے۔ ۱۹۲۷ء کے آخر میں ہندوستان کے دستور کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے سائمن کمیشن کا اعلان کیا گیا۔ جس میں کوئی ہندوستانی نہیں لیا گیا۔

اس طرح ہندوستانی بورژوا طبقہ کو مجبوراً تعاون اور دوستی کی تمام امیدیں ترک کر دینی پڑیں اور اس پر مجبور ہونا پڑا کہ عوام کی طرف رُخ کریں اور اپنی تائید میں ان کی قوت کو اکٹھا کریں تاکہ اس طرح سامراج سے کامیابی کے ساتھ سودا بازی ہو سکے۔ لیکن اس وقت حالات دس سال پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ تھے اسلیے کہ اس عرصہ میں عوامی قوتوں میں ایک نئی زندگی کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ ان میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا۔ ان کا اپنا سیاسی نقطۂ نظر پیدا ہو رہا تھا اور وہ نہ صرف سامراج کے خلاف بلکہ اپنے ہندوستانی لوٹنے کھسوٹنے والوں کے خلاف جدوجہد پر آمادہ ہو رہے تھے اب یہ چیز زیادہ صاف طور پر نظر آ رہی تھی کہ یہ کشمکش تین قوتوں میں تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اصلی کشمکش سامراج اور ہندوستانی عوام میں تھی اور ہندوستانی بورژوا طبقہ جھجکا ہوا۔ کبھی ایک سے تعاون کرتا اور کبھی دوسرے کے ساتھ جدوجہد میں شریک ہو جاتا۔ ان ہی حالات کی وجہ سے اب جو جدوجہد شروع ہوئی تو اس کی ایک عجیب و غریب نوعیت تھی۔ اس کے آثار ۱۹۲۷ء ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ اور اس نے پورا زور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۴ء کے درمیان پکڑا۔ ایک طرف تو اس جدوجہد کے اثر کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ یہ جدوجہد بہت شدید تھی اور ساتھ ہی کافی طویل عرصہ تک جاری رہی۔ لیکن اس کی کچھ اور عجیب خصوصیات بھی تھیں۔ یہ یکایک بھڑک اٹھتی

کبھی بہت تیز ہو جاتی اور کبھی مدھم پڑ جاتی اس کے مقاصد بھی برابر بدلتے رہے۔ کبھی سمجھوتے کی طرف رجحان بڑھتا اور کبھی لڑائی کی طرف اس کے ساتھ بار بار حکومت سے گفت و شنید بھی ہوتی، اور بغیر کسی سمجھوتے کے عارضی صلح بھی ہو جاتی۔ حتیٰ کہ آخر پوری تحریک بیٹھ گئی۔

۲۵-۱۹۲۴ء کے زمانے میں جو پہلی مرتبہ نیا عنصر داخل ہوا جس نے جدوجہد میں ایک نئی جان پیدا کر دی اگرچہ اس کی رہنمائی اس کے ہاتھ میں نہ آسکی۔ وہ صنعتی مزدور طبقہ ہے جو ایک آزاد قوت کی حیثیت سے ہندوستانی سیاسی زندگی میں داخل ہوا۔ جس نے غیر معمولی محنت بہادری، جوانمردی کے ساتھ اپنی لڑائیاں لڑیں۔ جو آپ اپنے لیڈر پیدا کرنے لگا۔ اس کے قدم بڑھے تو مزدور طبقہ کے اپنے سیاسی نظریہ یا سوشلزم کو ترقی ہونے لگی۔ اور پہلی مرتبہ ہندوستان میں اس کی سیاسی اہمیت پیدا ہونے لگی۔ اس نظریہ کا اثر نوجوانوں اور قومی تحریک کے بائیں بازو میں سرایت کرنے لگا۔ جس نے اس تحریک میں نئی زندگی اور نئی قوت پیدا کر دی اور اس کی نظروں کو وسیع کر دیا۔ ۱۹۲۴ء میں کانپور سازش کا جو مقدمہ چلا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سامراج انقلابی مزدور سیاست سے کتنا چوکنا رہتا ہے اور جیسے ہی اس کے آثار پیدا ہوئے اسے مٹانے میں سرگرم ہو گیا۔ مزدور کسان پارٹی نے ترقی کرنی شروع کی اور ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے زمانے میں سامنے آنے لگی۔ اور اس کے بعد جگہ جگہ مزدور یونینیں بننے لگیں ۱۹۲۸ء میں سارے ملک میں ہڑتالوں کی نہایت زبردست لہر چلی، جس میں کل ۳ کروڑ ۱۶ لاکھ سے زیادہ دن ضائع ہوئے اتنے پچھلے پانچ سال میں ملا کر بھی نہیں ہوئے تھے۔ بمبئی کے سوتی کارخانوں کے مزدوروں کی سبھا گرنی کامگار یونین نے زبردست ترقی کی اور سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس کے ممبروں کی تعداد ایک سال میں ۶۵ ہزار ہو گئی۔ مزدور سبھاؤں کے ممبروں کی تعداد میں ۷۰ فیصدی اضافہ ہوا۔ اس سال سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ میں مزدور طبقہ نے غیر معمولی حصہ لیا۔ جس کی بہت بڑی سیاسی اہمیت تھی۔ مزدور سبھاؤں میں غیر معمولی بیداری پیدا ہوئی۔ اور جدوجہد کا رجحان ترقی پانے لگا۔ اور ۱۹۲۹ء میں ٹریڈ یونین کانگرس کے اجلاس میں انقلاب پسندوں کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ تھے وہ واقعات جو ہندوستانی عوام کی ایک نئی عوامی جدوجہد کا پیش خیمہ تھے یہ تھی وہ قوت جو اس جدوجہد کو چلا رہی تھی۔

آئینی محاذ پر

ان تبدیلیوں کا مسلم سیاست پر بھی خاصا اثر ہوا۔ لیکن اس دور میں ایک طرف عوامی اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اور وہ براہ راست برطانوی شہنشاہیت سے گلو خلاصی کے لیے جد وجہد کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف برطانوی شہنشاہیت آئینی اصلاحات کے نام پر پھر اس اضطراب کو امید و بیم کی الجھی ہوئی راہوں میں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس صورت حال نے پنجاب کے مسلمانوں کو خاص طور پر متاثر کیا۔ اور در اصل یہ اثرات تھے جو بعد میں مجلس احرار کی تشکیل کا موجب بنے اور انہوں نے ایک نئی راہ متعین کرنے کی کوشش کی اس لیے اس پوری صورت حال کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس دور میں آئینی محاذ پر جو کارگزاری عمل میں لائی گئی اس کا قدرے تفصیلی جائزہ لینا چاہیئے۔

برطانوی حکومت نے اپنی مصلحتوں کے پیش نظر ۱۹۲۶ء میں ایک آئینی کمیشن قائم کیا تاکہ وہ ہندوستان میں پہنچکر حالات کی تحقیق کرے اور اپنی سفارشات برطانوی حکومت کے سامنے رکھے۔ اس کمیشن میں سب کے سب انگریز ارکان نامزد کیے گئے۔ کسی ہندوستانی کو اس کمیشن کا ممبر بنانا رموز مملکت کے منافی سمجھا گیا۔

اس کمیشن کے خلاف ہندوستان میں ہر طرف سے احتجاج ہونے لگا۔ اعتدال پسند سیاست دان بھی جو حکومت کے ساتھ ہر طرح تعاون کرنے کو ہمیشہ تیار رہا کرتے تھے، اس وقت اپنے آپ کو اور دیگر ہندوستانیوں کو اس کمیشن کی رکنیت سے محروم پاکر واویلا کرنے لگے۔ ہندوستانیوں کو اس کمیشن کی رکنیت سے محروم کرنے کو نسلی تعصب کا نتیجہ قرار دیا گیا اور اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ ہونے لگا۔

سائمن کمیشن کے اس تازہ چابک نے سیاست دانوں کو اور چمکایا اور وہ ہندوستان کے معاملے کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ مخلوط انتخاب اور ہندو مسلم مسئلہ کے حل کا شور ہونے لگا۔ کانگرس نے بھی اس مسئلہ میں خاص دلچسپی لینی شروع کی۔

گوہاٹی کانگرس کارزولیوشن

سنہ ۱۹۲۶ء کے آخری ایام میں کانگرس کا اکتالیسواں اجلاس آسام کے شہر گوہاٹی میں ہوا۔

اس اجلاس میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی :۔

"یہ کانگرس، مجلس عاملہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ہندو مسلم رہنماؤں سے مشورہ کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں کے موجودہ قابل افسوس اختلافات کو مٹانے کے لیے تجاویز مرتب کرنے کی خاطر فوری قدم اٹھائے اور اپنی رپورٹ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو ۳۱ مارچ ۱۹۲۰ء تک پیش کرے"

"اور یہ کانگرس آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو اختیار دیتی ہے کہ وہ اس بارے میں ملک بھر کے سب کانگرسیوں کو ہدایات دے اور مذکورہ بالا رپورٹ پر غور کرنے کے بعد جو اقدام مناسب سمجھے کرے"۔

مجلس عاملہ نے یکم جنوری کو کلکتہ میں اجلاس کرکے صدر کانگرس مسٹر سری نواس آینگر کو اختیار دیا کہ وہ مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے ہندو اور مسلم ارکان کی ایک کانفرنس بلائیں تاکہ ہندو اور مسلم اتحاد کا کام جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ مسٹر سری نواس نے سب ممبروں کو یکجا بلانے سے پہلے ان کے ساتھ علیحدہ علیحدہ گفتگو شروع کر دی۔ اسمبلی کے اجلاس کے اختتام پر انہوں نے ایک اپیل بھی شائع کی، جس میں باہمی اتحاد پر بے حد زور دیا گیا اور اختلافات کو دور کرنے کی تاکید کی گئی۔

فرقہ وارانہ انتخاب کے سلسلے میں ترمیم

۱۷ مارچ ۱۹۲۷ء کو نئی دلی میں کانگرس کے ہندو ممبروں کا ایک جلسہ ہوا جس میں اس مسئلہ پر تبادلہ خیالات کیا گیا کہ فرقہ وارانہ انتخاب کے موجودہ سلسلہ میں کیا کیا ترمیم کی جانی چاہیے۔ کچھ مسلم رہنما اسی روز ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان پر جمع ہوئے اور انہوں نے بھی حالات کا جائزہ لیا۔ باقی ہندو رہنماؤں نے بھی ان دنوں اس مسئلہ پر غور و خوض کیا۔

مشہور دلّی تجاویز

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو تقریباً ۳۰ مسلم رہنما ویسٹرن ہوٹل میں جمع ہوئے اور انہوں نے موجودہ

فرقہ وارانہ انتخاب کے سلسلے میں تبدیلیوں یا ترمیمول کے متعلق چھ گھنٹے تک سوچ بچار کی ان رہنماؤں میں مسٹر جناح، مہاراجہ محمود آباد، سر محمد شفیع، سر ذوالفقار علی خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، سر عبدالقیوم، سر عبدالقادر، سر محمد یعقوب بھی شامل تھے۔ مسٹر جناح اس جلسہ کے صدر تھے انہوں نے حاضرین کو صورت حال سے آگاہ کیا اور صدر کانگرس نے جو مختلف متبادل تجاویز بھیجی تھیں۔ انہیں پڑھ کر سنایا یہ تجاویز زیادہ مخلوط انتخاب کی بنیاد پر تھیں۔

طویل بحث و تمحیص کے بعد اس جلسہ نے خاص شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب کو منظور کر لیا اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ "آئین اساسی کے کسی آیندہ خاکے میں مجالس آئین ساز میں نمائندگی کے متعلق مسلمانوں کو مذکورہ ذیل تجاویز کی بنیاد پر سمجھوتہ منظور کر لینا چاہیے:

(۱) سندھ کو بمبئی کے صوبے سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنایا جائے۔

(۲) شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں اصلاحات اسی نہج پر رائج ہونی چاہئیں جس نہج پر وہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں رائج ہوں۔ اس صورت میں مسلمان ان تمام صوبوں میں مشترکہ انتخاب قبول کرنے کو تیار ہیں۔ اور وہ اس بات پر بھی رضامند ہیں کہ وہ بنگال، پنجاب، سرحد اور دوسرے صوبوں میں ہندو اقلیتوں کو وہی مراعات دیں جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو دی جائیں۔

(۳) پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے تناسب سے ہوگا۔

(۴) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو کم از کم ایک تہائی نمائندگی ملے گی۔ اور وہ بھی مخلوط انتخاب سے۔

"ان تجاویز کی تصدیق مسلم جماعتوں کی طرف سے ہوگی۔ لیکن حاضرین کو امید ہے کہ ہندو ان تجاویز کو قبول کر لیں گے۔ اور مسلمان جماعتیں ان پر مہر تصدیق ثبت کر دیں گی۔

"ملازمتوں کے سوال اور دوسرے مسئلے جو ایسے قانونی مسودوں یا تحریکوں کے بارے میں تحفظات کے متعلق ہوں جو کسی فرقہ کے مذہب یا رواج و رسم پر اثر انداز ہوں یا جن کا مختلف فرقوں کے باہمی مفاد پر اثر پڑتا ہو۔ ان پر بھی جلسے میں بحث کی گئی۔ مگر اس کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور ان پر دوبارہ اس وقت غور ہوگا۔ جب اس بڑی تجویز کو مقبولیت عام حاصل ہو جائیگی۔"

مخلوط انتخاب کے لیے مسلمانوں کا اقدام

ان تجاویز سے صاف ظاہر ہے کہ سب سے اوّل مسلمانوں نے ہی مخلوط انتخاب قبول کرنے کے لیے قدم اٹھایا۔ گو مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جداگانہ انتخاب کے حق میں تھا۔ پھر بھی مسلم رہنماؤں نے جن میں ہر خیال کے لوگ شامل تھے۔ مثلاً انتہا پسند مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری، اقدامت پسند سر محمد شفیع، سر عبدالقیوم، سر ذوالفقار علی اور ان کے بین بین مسٹر جناح اور مولانا شفیع داؤدی نے اپنی قوم کو مخلوط انتخاب کا یہ فارمولا منظور کرنے کے لیے کہا۔ اس فارمولا سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہونا لازمی تھا۔ مگر انہوں نے اس اختلاف کو بھی گوارا کیا اور ہندو مسلم مفاہمت اور ہندوستان کی یگانگت اور مرکزیت کو قائم رکھنے کے لیے ہندوؤں کا ساتھ دینے اور اپنے مسلم بھائیوں سے تھوڑی یا بہت مخالفت مول لینے کا حوصلہ کیا۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ ان تجاویز کا کیسا استقبال ہوا۔

کانگرس کی مجلس عاملہ کا محتاط اظہار خیال

ان تجاویز کے پیش ہونے کے اگلے روز ہی یعنی ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس نئی دہلی میں ہوا اور اس میں یہ تجویز منظور کی گئی:۔

مجلس عاملہ نے ہندوستان بھر کے مسلم نمائندوں کی غیر رسمی کانفرنس کی کارروائی پر غور و خوض کیا ہے اور ساتھ ہی کانگرس پارٹی کے ہندو ممبروں کے جلسہ کی روئداد پر بھی جو پچھلے ہفتہ ہوا تھا۔ مجلس عاملہ اس غیر رسمی کانفرنس کے اس فیصلہ پر دلی پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے کہ تمام ملک میں اقلیتوں کے باہمی تحفظ کے ساتھ سارے ملک میں مشترکہ انتخاب کے طریق کو قبول کر لیا جائے۔ مندرجہ ذیل سب کمیٹی بنائی جاتی ہے تاکہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمائندوں کے ساتھ تفصیلات پر بحث کرے۔ مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سری نواس آئینگر اور مولانا محمد علی۔ مجلس عاملہ کو امید ہے کہ اس بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تسلی بخش سمجھوتہ جلد ہی عمل میں لایا جائے گا۔

اس طرح کانگرس کی مجلس عاملہ نے مخلوط انتخاب اور اقلیتوں کے متقابل حقوق پر خاص

زور دیا اور باقی مسائل کو تفصیلات قرار دے کر گفتگو کے مفاہمت کی طرح ڈالی۔

غیر کانگرسی ہندو ممبروں کا رویہ

مرکزی مجالس قانون ساز کے غیر کانگرسی ہندو ممبروں نے پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ۲۳ مارچ کو اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کی اور انہوں نے مندرجہ ذیل اصولوں کو بنائے گفتگو قرار دیا۔

۱۔ ملک کی تمام مجالس قانون ساز کے لیے انتخاب مخلوط ہو۔

۲۔ ملک کی تمام مجالس قانون ساز میں آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کی جائیں۔

۳۔ مذہبی اور نیم مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے آئین ملکی میں تحفظات مقرر کیے جائیں۔

۴۔ صوبوں کی زبان یا دیگر ضروری وجوہ کی بنا پر از سر نو تقسیم کا مسئلہ غور کے لیے کھلا چھوڑا جائے۔ غیر کانگرسی ہندوؤں کے اس فیصلہ نے کانگرس کی محتاط روش سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس نے صوبوں کی تقسیم کے مسئلہ کو کھٹائی میں ڈالنا چاہا۔ اور محض مخلوط انتخاب کو ہی اپنانا شروع کیا۔ ساتھ ہی اس نے مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دیئے جانے کی مخالفت کر دی۔

پنجاب کی ہندو سبھا

۲۳ مارچ کو پنجاب کی ہندو سبھا نے بھی ایک تجویز منظور کی۔ جس میں کہا گیا کہ انڈین نیشنل کانگرس کو مسلمان جماعتوں سے گفتگو کرتے وقت ہندوؤں کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں ہے اس کا کوئی سمجھوتہ ہندوؤں کو پابند نہیں کرے گا۔ اور ہندو مہاسبھا ہی ایسے معاملات کو طے کر سکتی ہے۔

سکھوں کا نقطہ نگاہ

۲۵ مارچ کو سردار منگل سنگھ نے جو ان دنوں سنٹرل لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انڈین

نیشنل کانگرس کے صدر کے نام ایک خط لکھا جس میں اور باتوں کے علاوہ کہا گیا کہ سکھوں میں اس مسئلہ پر اتفاق رائے ہے کہ جداگانہ انتخاب قومیت کی ترقی کے راستے میں حائل ہے اس لیے وہ اس بُرے اصول کو کلیتہً ختم کرنے کے حق میں ہیں۔ بشرطیکہ مسلمان اس کو کلیتہً ترک کرنے کا فیصلہ کریں۔ بہتر ہوتا کہ وہ جرأت سے کام لیتے اور نشستوں کی تشخیص کے بغیر مخلوط انتخاب کو قبول کرتے۔ مگر موجودہ حالات میں مخلوط انتخاب کو نشستوں کی تخصیص کے ساتھ بھی خوش آمدید کہنا چاہیئے۔ مسلمان دوستوں نے بڑی فیاضی سے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ غیر مسلم اقلیتوں کو سندھ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں وہی رعائتیں دینے کو تیار ہیں جو مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں ملیں گے۔ لیکن انہوں نے بڑی ہوشیاری سے پنجاب کے معاملے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سکھوں کا کیا بنے گا؟ میں پوچھتا ہوں کہ وہ بہار اور یوپی کے مسلمانوں کی طرح ایک اقلیت نہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ان سے نئے نظام میں کیا سلوک کیا جائیگا۔۔۔

جو بات میں آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پنجاب کے خاص حالات کو زیر غور لانا چاہیے اور سکھوں کے لیے مناسب نمائندگی کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ سکھ ایک اہم اقلیت ہیں، جو بہت بڑی حیثیت رکھتی ہے۔"

نہرو رپورٹ

جب ان کوششوں میں ناکامی ہوئی تو ۱۹۲۷ء کے آخر میں مدراس کانگرس نے فیصلہ کیا کہ سوراج کا آئین مرتب کرنے کے لیے دہلی میں مارچ ۱۹۲۸ء سے قبل ایک خاص کنونشن بلائی جائے۔ اس اجتماع خاص میں ہندوستان کی بہت سی جماعتوں کو مدعو کیا گیا اور انہوں نے اس کارروائی میں حصہ لیا۔

نہرو کمیٹی

آئین کی ترتیب کے لیے ایک مختصر سی کمیٹی مقرر کی گئی جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو بنائے گئے۔ اس کے ارکان حسب ذیل تھے۔

سر علی امام، مسٹر شعیب قریشی، مسٹر اینے، مسٹر جیکار، مسٹر پردھان، سردار منگل سنگھ، سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جوشی۔

مسٹر جیکار نے کہا کہ وہ کمیٹی میں کام کرنے کے ناقابل ہیں۔ اور مسٹر جوشی نے کہا کہ وہ فقط اس وقت حصہ لیں گے جب مزدوروں کے معاملات زیر غور ہوں۔ سر علی امام علالت کے سبب سوائے ایک کے اور کسی اجلاس میں حصہ نہ لے سکے۔

اس کمیٹی کی رپورٹ کو پنڈت نہرو کی صدارت کے باعث نہرو رپورٹ کا نام دیا گیا۔

فرقہ وارانہ فیصلے

نہرو رپورٹ کے فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق حسب ذیل امور قابل ذکر ہیں:

(۱) یہ فیصلہ کیا گیا کہ جداگانہ انتخاب کو ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ مخلوط انتخاب کو رائج کیا جائے۔ اس فیصلہ کی بنیاد یہ تخیل تھا کہ جداگانہ انتخاب سے متحدہ قومیت پیدا نہیں ہو سکتی اور مخلوط انتخاب اس کا عمدہ ذریعہ ہے۔

(۲) مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعین بھی غیر مفید قرار دیا گیا۔ مگر جب یہ سمجھایا گیا کہ اس صورت میں مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی تقریباً نفی کے برابر رہ جائے گی۔ تو فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں حاصل شدہ پانگ سے محروم کر دیا جائے اور اس کی جگہ ان کو آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ مگر ان کو یہ حق ہے کہ وہ مزید نشستوں کو جیتنے کی کوشش کر سکیں۔

(۳) پنجاب اور بنگال میں انتخابات کو کھلا رکھا گیا۔ اور کسی کے لیے کوئی نشست مخصوص نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(۴) مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دینے سے انکار کیا گیا اور ان کو اسی تناسب سے نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو صوبجاتی نشستوں کے فیصلے کی رُو سے انہیں مرکز میں حاصل ہو سکیں۔

مسلمانوں پر اثر

ان فیصلوں کی رُو سے مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں موجودہ حصے سے کم تجویز کیا گیا۔ پنجاب اور بنگال میں ان کو قسمت آزمائی کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ اور مرکز میں انہیں ایک تہائی کا یقین دلانے سے بھی انکار کیا گیا۔

پنجاب کا جھگڑا

مرکز کا فیصلہ ابھی معلق تھا کہ صوبوں کے متعلق بحث و تمحیص ہونے لگی۔ جہاں تک مسلم اقلیت کے صوبوں کا تعلق ہے ان مسلم نمائندوں نے جو آزاد خیال جماعتوں کی طرف سے نمائندگی کر رہے تھے۔ ان تجاویز کو جو ان صوبوں سے متعلق تھیں۔ اس امید اور تمنا میں بلا احتجاج منظور کر لیا کہ پنجاب کے معاملے میں جھگڑا ہو جائے گا۔ پنجاب کے مسلم نمائندے نشستوں کی تخصیص کے بغیر نہرو رپورٹ کے فارمولے کو تسلیم نہیں کریں گے اور اس طرح ان کی قوم پرستی پر بھی دھبہ نہ لگے گا اور نہرو رپورٹ کی پابندیوں سے قدم آزاد بھی ہو جائیں گے۔

لیکن اور صوبوں کا فیصلہ ہوتے دیکھ کر محض پنجاب کا جھگڑا چکانا باقی رہ جاتا تھا۔ اس لیے سب بزرگوں نے پنجاب کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔

سکھوں کا رویہ

سکھ نمائندوں کا رویہ بھی اسی بنیاد پر مبنی تھا کہ پنجاب کے مسلم رہنما نہرو رپورٹ کے فارمولے کو تسلیم نہ کریں گے۔ اور اس طرح ان کا دامن بھی فرقہ پرستی کے داغ سے آلودہ نہ ہوگا۔ اس لیے وہ بھی سکھوں کے لیے خاص نمائندگی کے دعوے کرنے کے بعد خالص قوم پرستی کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بالآخر اس فارمولے پر بات آئی کہ:

(۱) ہر بالغ کو حق رائے دہی عطا کیا جائے۔

(۲) حلقہ ہائے انتخاب مخلوط ہوں۔

(۳) کسی اکثریت یا اقلیت کے لیے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

(۴) درجہ نوآبادیات کی حکومت قائم ہو۔

(۵) دس سال تک مذکورہ بالا شرائط پر عمل کرنے کے بعد اگر کوئی فرقہ ضروری سمجھے تو فرقہ وارانہ نیابت کا سوال از سرِ نو زیرِ غور لایا جائے۔

مسلمانوں کی کیفیت

جبتک پنجاب کے مسلم رہنماؤں نے اس فارمولے کو تسلیم نہ کیا سب ہندو اور سکھ انہیں تسلیم کرنے کی تاکید کر رہے تھے اور قوم پرستی کی کشتی کے ناخدا بننے کے لیے کہہ رہے تھے ادھر مسلم اقلیت کے صوبوں کے رہنما چپکے چپکے انہیں اس فارمولے کو مسترد کرنے کے لیے کہہ رہے تھے تاکہ وہ اپنی غلط روش کے خمیازہ سے بچ نکلیں۔ مگر پنجاب کے مسلم رہنماؤں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اس فارمولے کو منظور کر کے ایک مرتبہ پھر اپنی قوم پرستی کا ثبوت دے ہی دیں' ان کا اس فارمولا پر دستخط کرنا ہی تھا کہ سکھوں اور ان کے ساتھ ہندوؤں کے اوسان خطا ہونے لگے' وہیں اس فارمولے سے بیزاری اور اختلاف کا کم و بیش مظاہرہ شروع ہونے لگا۔

مسلمانوں پر اس فیصلہ کا اثر

مسلمانوں کے ایک فریق نے جو جداگانہ انتخاب کا حامی تھا۔ اس فیصلہ پر دستخط کرنے والوں کو اسلامی حقوق کا قاتل کہہ کر پروپیگنڈہ شروع کیا۔ مسلمانوں میں خوب لے دے ہوئی۔ جلسوں میں خوب تُو تُو مَیں مَیں بلکہ ہاتھا پائی تک نوبت آئی۔ لیکن چند روز کے پروپیگنڈا کے بعد مسلمانوں کو سمجھ آنے لگی کہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے مسلمان صوبجاتی معاملہ میں نہرو رپورٹ کے اس مشہور فیصلے سے کچھ ایسے خسارے میں نہیں رہتے۔ چنانچہ عام رجحان اس فیصلہ کے حق میں ہونے لگا۔

سکھوں اور ہندوؤں پر اس کا اثر

جہاں تک ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق ہے انہوں نے اس فیصلہ کے خلاف آواز اٹھانا

شروع کی پنڈت جواہر لال نہرو نے نہرو رپورٹ کے ساتھ ایک ضمیمہ شائع کیا تھا جس میں اعداد و شمار کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ بنگال اور پنجاب میں مسلم اور غیر مسلم آبادیاں اس طرح سے تقسیم ہوئی ہیں کہ مسلمان ان دونوں صوبوں میں نہ فقط آبادی کے لحاظ سے نشستیں لے جائیں گے بلکہ اغلب ہے کہ اس سے بھی زیادہ نشستیں حاصل کر سکیں۔ جو بات پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کو آمادہ کرنے کے لیے کی تھی، وہی ہندوؤں اور سکھوں کو پریشان کرنے کا باعث ہوئی۔ جوں جوں دن گزرنے لگے۔ انہیں مسلم اکثریت کا ہوا ڈرانے لگا۔ ہندوؤں نے سکھوں کو اپنی ڈھال بنایا اور انہیں اس فارمولے کے خلاف اکسایا۔

پنجاب کے ہندوؤں کے علاوہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور خود گاندھی جی بھی سکھوں کے ہمنوا ہوتے اور انہوں نے سکھوں سے صاف صاف کہا کہ اس فیصلہ میں ان سے ظلم ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں میں اس فارمولے کی مخالفت زیادہ ہونے لگی حتیٰ کہ وہ لوگ جنہوں نے اس فارمولا پر لکھنؤ میں دستخط کیے تھے۔ اس اعلان پر مجبور ہوئے کہ چونکہ ہماری قوم اس فارمولا کو قبول نہیں کرتی۔ اس لیے ہم اپنی قوم کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور اس فارمولے کی موافقت سے دستبردار ہوتے ہیں۔

آئینی صورت حال کے یہ تقاضے تھے جنہوں نے پنجاب کے ان پرانے "خلافتیوں" کو نیا محاذ بنانے پر مجبور کیا۔ دراصل یہ ردعمل تھا نہرو رپورٹ کی حمایت اور مخالفت کا۔ چونکہ کانگرس دن بدن مسلمانوں کے مطالبات سے منہ موڑتی جا رہی تھی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ ملازمتوں میں اپنا تحفظ چاہتا تھا اور کیونکہ پچھلے دس سال کے اندر مسلمان امراء کے بیٹے بھانجے پڑھ لکھ کر ملازمتوں میں نمایاں حیثیت حاصل کرنے کے خواہش مند تھے اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ پنجاب میں ان کو پورے اختیار والی حکومت میسر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے زمیندار اور اوپری طبقہ کے سیاستدان ہمیشہ سے ہی لکھنؤ پیکٹ کے مخالف رہے ہیں۔ چنانچہ جب آئینی اصلاحات کا مسئلہ شروع ہوا تو یہاں اسی زمانے میں ایک اور تحریک ابھری، جو چھپن فیصدی کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ چھپن فیصدی کی تحریک اپنے تمام عوامی کردار کے باوجود اوپری طبقے

کی آرزوؤں کی مظہر تھی، اور اس تحریک کے خد و خال جاننے کے لیے اس تحریک پر ذرا تفصیل سے بات کرنا ضروری ہوگی۔

چھپن فیصدی حقوق کی تحریک

سنہ ۱۹۲۹ء کا سال تھا اور نومبر کا مہینہ'!.....

لاہور کے گلی کوچوں میں یہ اشتہارات لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے، یہ ایک نئی تحریک کے آغاز کا اعلان تھا۔ اس کے بعد اس تحریک کا چرچا روز بروز بڑھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے ہر گلی کوچے میں اس کے نعرے گونجنے لگے، جلسے ہونے لگے، رضاکاروں کی بھرتی کا اعلان ہونے لگا۔ چھپن فیصد رضاکاروں کی تنظیم وجود میں آئی۔ خاکی بند گلے کا کوٹ، خاکی پتلون، سر پر کھال کی سیاہ ٹوپی، جس پر چھپن فیصد کا نعرہ چسپاں ہوتا تھا۔ اس چھپن فیصد کور کے رضاکاروں کی وردی قرار پائی۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک پنجاب کے اکثر شہروں میں پھیلنے لگی۔ اور دو تین مہینے پنجاب کے مسلمانوں کی زندگی میں اس کا بہت ہی چرچا رہا۔ اس کے حامی و مخالف آپس میں گتھم گتھا بھی ہوئے۔ ایک دوسرے کے جلسوں کو درہم برہم کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ بیان بازیاں بھی ہوئیں۔ نہتوں پر حملے بھی ہوتے۔ یہ سبھی کچھ ہوا یہ تحریک خاموشی کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی ڈوب گئی، اور پھر کبھی نے اس کا نام بھی نہ لیا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ایک ایسی آواز ضرور بلند کی۔ جو پنجاب کے مسلمانوں کے لیے بہت ہی اہم تھی، دراصل یہ وہ آواز تھی جس نے بعد میں ایک زبردست تحریک کا روپ اختیار کر لیا۔ اور سنہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۹ء میں پنجاب کے مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق اور آبادی کے مطابق مجالس قانون ساز میں نمائندگی حاصل کرنے کے لیے بھی جدوجہد کرنا پڑی تھی، لطف یہ ہے کہ اس مطالبے کی مخالفت ہندوؤں کے ساتھ ساتھ خود مسلمانوں کی طرف سے بھی ہوتی تھی، اس لحاظ سے بیسویں صدی کی یہ تیسری دہائی (۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۹ء) بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس نیم براعظم میں مختلف اقوام کے درمیان ایکتا کی سب سے کامیاب تحریک اس دہائی میں پلی، اور ہندو مسلم فسادات بھی اسی دہائی میں سب سے زیادہ ہوئے

انگریزوں کے خلاف منظم تحریک بھی اسی دہائی میں چلی اور اس تحریک کی ناکامی اور اس کے مہلک نتائج بھی اسی دہائی کو برداشت کرنے پڑے۔

تحریک کا آغاز

چھپّن فیصد حقوق کی تحریک کا آغاز ہی خاصا دلچسپ تھا۔ اس کے مقاصد دو دھاری تلوار کی طرح کے تھے۔ اس کی پشت پر جو اذہان کام کر رہے تھے وہ اپنی ذہانت کے لیے اپنے وقت میں خاصی شہرت کے مالک تھے۔ آج سالہا سال بعد ان تمام پہلوؤں پر کھل کر بات کرنا قدرے آسان ہے، گو آج کچھ حلقوں میں بعض شخصیتوں کے متعلق جذبات مرتعش ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وقت نے جذبات کو تاریخ بستہ کر دیا ہے کہ آج ان مختلف واقعات کے بارے میں تفصیل سے بات چیت کی جا سکتی ہے۔

چھپّن فیصد کی یہ تحریک "روزنامہ انقلاب" کی پیدا کردہ تھی۔ روزنامہ مذکور پنجاب کے حاکم مسلمانوں کی آواز سمجھا جا رہا تھا۔ جس طرح کسی زمانے میں عربوں میں یہ ضرب المثل مشہور تھی کہ مشرق وسطےٰ کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی جاننی ہو تو نوری السعید پاشا کی حرکات پر نگاہ رکھو، اسی طرح پنجاب میں روزنامہ انقلاب کی پالیسی حاکم مسلمانوں کی آواز سمجھی جاتی تھی، پنجاب کے حاکم مسلمانوں کی خواہشوں اور ارادوں کو جاننے کے لیے انقلاب کے صفحات اور سالک و مہر کے افتتاحیوں اور افکار و حوادث پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انقلاب کا مسلک کسی بدنیتی پر مبنی تھا۔ اس سے اختلاف ہو سکتا ہے اور اپنے زمانے میں اکثر بزرگوں کو اس سے اختلاف رہا۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ پنجاب کے مسلمان حاکموں کے مسلک اور ان کے طریق کار کو سالک و مہر نے صدق دل سے قبول کیا تھا اور وہ ہمیشہ اس مسلک کے زبردست موید رہے۔ یہ مسلک وہی تھا جو سر فضل حسین نے اختیار کیا تھا۔ اور جس کے حصول کے لیے انہوں نے یونی نسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی تھی، آج یونی نسٹ پارٹی کا نام آتے ہی ہمیں خضر حیات کا نام یاد آ جاتا ہے۔ اس لیے ہم جذبات سے مغلوب ہو کر صحیح رائے قائم نہیں کر پاتے۔ لیکن یونی نسٹ پارٹی کے قیام کا موضوع اپنی جگہ پر الگ سے اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے متعلق تحقیق کرنے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر

روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال چھپن فیصد تحریک کا عوامی آغاز بھی سر فضل حسین کی ذہانت ہی کا نتیجہ دکھائی دیتا ہے۔ اس آغاز کا تعلق اس زمانے سے ہے جب علم الدین شہید کی نعش کے حصول کی تحریک چلی تھی اور سر شفیع اور سر فضل حسین کی مداخلت سے نعش مل گئی تھی۔ اس کامیابی کا سہرا علم الدین شہید کمیٹی کو حاصل ہوا تھا۔ اس کمیٹی کے کرتا دھرتا ملک لال دین قیصر، غلام مصطفےٰ حیرت، محمد دین تاثیر، فیروز الدین احمد وغیرہ تھے، چنانچہ جیسے ہی یہ تحریک ختم ہوئی۔ انقلاب نے ۱۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو ایک اداریہ سپرد قلم کیا۔ اس اداریے کا عنوان تھا۔

"ملک لال دین قیصر سے خطاب

شہید علم الدین کی میت سے ایک اہم سبق"

اس پورے اداریے میں ملک لال دین قیصر اور ان کے رفقاء کی بہادری اور جوانمردی کی تعریف تھی۔ اور ان سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اب مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوں چنانچہ اداریہ میں کہا گیا تھا۔

"آج ہم انتہائی دلسوزی کے ساتھ قیصر اور ان کے رفقاء سے عرض کرتے ہیں کہ وہ ملت اسلامیہ ہند کے زہرہ گداز مصائب پر بھی توجہ مبذول فرمائیں، مسلمان افتراق سے دوچار ہو چکے ہیں۔ فرقہ بندی میں اپنی حکومت کھو چکے ہیں، ان کی تعداد کم نہیں، ان میں ہمت و جرأت کا فقدان نہیں۔ ان میں قربانیوں کا جوش و خروش موجود ہے۔ مگر ان کی ساری قوتیں خانہ جنگی میں ضائع ہو رہی ہیں۔ وقت نازک ہے۔ حالات اضطراب انگیز ہیں، ہندو متحد ہیں اور قدم قدم پر فائدے اٹھا رہے ہیں۔ مسلمان متفرق و منتشر ہیں اور ہر جگہ نقصان و خسران سے تباہ ہو رہے ہیں۔ گاندھی جی جو خود حریت حقہ سے بے بہرہ ہیں۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس کی دعوے داری حریت مالویہ کی حکومت پرستی سے قطعاً شرمسار نہیں ہوتی، وہ مالویہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہیں، اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو،

سری نواس آئنگر اور تمام دوسرے ہندوؤں کی یہی حالت ہے۔ مگر مسلمانوں کا کوئی ابوالکلام کسی محمد علی سے ملنے کے لیے تیار نہیں۔ کوئی انصاری، کسی اقبال یا شفیع سے بات کرنے کا روادار نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابوالکلام اور انصاری بھی تباہ حال ہیں، اور ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے پر جی رہے ہیں۔ اور محمد علی، اقبال اور شفیع کی تمام مساعی بھی بے نتیجہ اور بے اثر ہیں۔ کیا کوئی اللہ کا بندہ ان دردانگیز حالات کی درستی کے لیے اٹھے گا۔!"

۱۹ نومبر کے انقلاب میں ملک لال دین قیصر کے نام یہ اپیل کی گئی تھی، اب اس اپیل کے دوسرے دن ہی، انقلاب کی ایک خبر جو جلی حروف میں شائع کی گئی تھی، ملاحظہ ہو اس خبر کی سرخیاں یہ تھیں۔

"کانگرس کو مسلمانوں کا آخری الٹی میٹم

لاہور میں حفاظت حقوق کی مہم شروع ہو گئی"

"علم الدین کمیٹی کے مجاہدوں کا نیا میدانِ عمل، چھپن فیصد کمیٹی اور کور کا قیام"

۱۹ نومبر کی شام کو عبدالمجید سالک کی صدارت میں درد دل رکھنے والے مسلمانوں کا ایک جلسہ دفتر انقلاب میں منعقد ہوا۔ اس میں موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ اور طویل بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ حفاظت حقوق کے لیے ایک جماعت بنائی جائے۔ اسی اجلاس میں ایک رضا کار کور بنانے کا فیصلہ بھی ہوا اور یہ بھی طے پایا کہ ہر رضا کار جو اس کور میں بھرتی ہو ایک حلف اٹھائے۔

حلف نامہ

"میں چھپن فیصد کور میں شامل ہوتا ہوں، اور خدائے واحد کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے جملہ حقوق کی حفاظت کے لیے قربانی پر آمادہ رہوں گا۔ اس سلسلے میں جماعت مجھے جو حکم دے گی، اس کی پوری پوری تعمیل کروں گا۔"

اس اجلاس میں اس جماعت کی ایک مجلس عامہ اور مجلس عاملہ بھی منتخب کی گئیں۔

مجلس عامہ

سید عبدالقادر پروفیسر اسلامیہ کالج، ملک لال دین قیصر، شیخ غلام مصطفےٰ حیرت، ملک عبدالمجید ایڈیٹر مسلم آؤٹ لک، اختر علی خاں مدیر زمیندار، سید عنایت شاہ، مالک سیاست، غلام رسول مہر، عبدالمجید قرشی، محمد دین تاثیر پروفیسر اسلامیہ کالج شمس الدین حسن، ایڈیٹر خاور، میر عزیز الرحمان، مسٹر امام علی نازش رضوی،

مجلس عاملہ

پروفیسر سید عبدالقادر، ملک لال دین قیصر، شیخ غلام مصطفےٰ حیرت، پروفیسر محمد دین تاثیر، عبدالمجید قرشی پر مشتمل تھی۔ عبدالمجید قرشی کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اور طے کیا گیا کہ مجلس عاملہ اپنے اختیارات سے دو ممبروں کو نامزد کر سکتی ہے۔ اس جماعت کا دفتر غالباً کوچہ چابک سواراں میں قائم کیا گیا تھا۔ کیونکہ شیخ غلام مصطفےٰ حیرت کوچہ چابک سواراں میں رہتے تھے اور ملک لال دین قیصر بھی قریب ہی کوچہ گگے زئیاں میں رہائش پذیر تھے علم الدین کمیٹی کا دفتر بھی کوچہ چابک سواراں میں شیخ غلام مصطفےٰ حیرت کی بیٹھک پر ہی بنا تھا۔ چنانچہ اسی جگہ چھپن فیصد کمیٹی کا دفتر قائم کر دیا گیا۔ رضاکاروں کی کور کے مہتمم بھی شیخ غلام مصطفےٰ حیرت ہی مقرر ہوئے۔

شیخ غلام مصطفےٰ حیرت کی یہ بیٹھک اس زمانے میں شعر و سیاست سے دلچسپی رکھنے والے باغی قسم کے نوجوانوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ شیخ غلام مصطفےٰ حیرت مشن اسکول کے سامنے مسجد فضل الٰہی کے نیچے سٹیشنری کی دکان کیا کرتے تھے، چنانچہ دن کو ان کی یہ دکان ان نوجوانوں کا اڈہ ہوتی، اور شام کو اندرون کوچہ چابک سواراں میں ان کی بیٹھک میں یہ سب نوجوان جمع ہوتے۔ اسی بیٹھک سے اپنے وقت کا مشہور ادبی ماہنامہ "فردوس"

جاری ہوا۔ یہ 'فردوس' حیرت اور بدرالدین بدر کی مشترکہ ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اور اس میں تاثیر، مجید ملک، صوفی تبسم، چراغ حسن حسرت، پطرس بھی لکھا کرتے تھے۔

ملک لال دین قیصر اور شیخ غلام مصطفےٰ حیرت دونوں جگری دوست تھے۔ ملک لال دین قیصر تو مولانا عبدالمجید سالک کے ہم زلف تھے۔ اور اس لیے سالک اور مہر کو ملک لال دین قیصر کا پاس بھی بہت ہوتا تھا۔ ویسے بھی ملک لال دین قیصر اپنے زمانے میں بہت جیالے جوان تھے، اور ان کے پنجابی شعروں میں انگارے ہوا کرتے تھے۔ جلیانوالہ باغ کے حادثے کے بعد جب یہاں لاہور میں مارشل لا لگا، اس میں لال دین قیصر کو بھی سزائے موت ہوئی تھی، لیکن جب عام معافی ہوئی تو اس میں ان کی جان بخشی ہو گئی تھی۔

پنجاب خلافت کمیٹی

اب اس وقت چھپن فیصد تحریک کے لیے قریہ قریہ جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور انقلاب نے اس تحریک کو خوب خوب اچھالا، اور پنجاب خلافت کمیٹی نے جس پر اس وقت مجلس احرار کے قائدین کا قبضہ تھا۔ اس تحریک کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ چنانچہ ۲۶ نومبر ۱۹ء کو مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کا ایک طویل بیان زمیندار میں شائع ہوا۔

"چھپن فیصدی حقوق کا مطالبہ کرنے والے مسلمانوں کو اپنے حقوق منوانے کے لیے یہی موقع نصیب ہوا تھا۔ وہ کھل کر یہ بات کیوں نہیں کرتے کہ کانگرس مکمل آزادی کے لیے جو جدوجہد شروع کرنے والی ہے اس میں انتشار و اختلاف پیدا کرنے کے لیے یہی موقع ہے۔ اور اسی موقع پر مسلمانوں کے حقوق کا سوال اٹھایا جانا چاہیئے۔"

راست اقدام کے حامی

ان بانیان احرار کا ایک اور بنیادی تضاد بھی تھا۔ جس سے یہ تمام عمر چھٹکارا نہ پا سکے اور نہ اس تضاد کو حل کر سکے، حقیقت یہ ہے کہ یہ تضاد بھی ان کے اور ان کی جماعت کے

طبقاتی حیثیت کی پیداوار ہی تھا۔ لیکن نہ تو یہ جیالے لیڈر اپنے طبقے کی خصوصیات، حدود اور قیود کو بھانپ سکے اور نہ ان کو توڑ سکے تاہم بنیادی طور پر بانیان احرار کی اکثریت سامراج دشمن جذبے کی مظہر تھی۔ اور اس کے اظہار کے لیے وہ ایک ہی راہ پر یقین رکھتے تھے، اور وہ راہ وہی تھی جو عدم تعاون کی تحریک نے متعین کی تھی کہ عوام کو متحرک کرو، ان کو اتنی تعداد میں جیلوں میں لے جاؤ، کہ حکومت کی مشینری معطل ہو جائے اور وہ عوامی تحریک کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ یہ ایک مبہم سا خاکہ تھا جس میں وہ تمام عمر الجھے رہے۔ لیکن عملاً ہوا کیا کہ عدم تعاون تحریک کی ناکامی کے بعد سالہا سال تک عوامی تحریک کے راست اقدام کی راہ آنکھوں سے دور اور دور ہٹتی گئی اور چاروں طرف ہندو مسلم فسادات اور تلخیاں ابھرتی رہیں، جب وہ تھمیں تو آئینی موشگافیاں اٹھ کھڑی ہوئیں اور یہ دونوں میدان ایسے تھے جن میں یہ پرانے خلافتی کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ نہ تو وہ فرقہ پرست مسلمان کے انداز میں سوچنے کی عادت ڈال سکتے تھے، اور نہ ہی وہ آئینی محاذ پر کارہائے نمایاں کرنے کے جوہر رکھتے تھے، کیونکہ اس نچلے درمیانہ طبقے کے پاس نہ تو ووٹ تھا اور نہ ان آئینی موشگافیوں سے دلچسپی تھی۔ اس کی پوری جدوجہد اصل میں معاشی تھی، اس لیے کہ اس طبقے کے پاس نہ تعلیم تھی، نہ وسائل تھے اور نہ ہی خواہش تھی کہ وہ سرکاری نوکری حاصل کرے۔ اور اس کے لیے اپنے حقوق کی ضمانت طلب کرے۔ یہ خواہش اور ضرورت ایک بالکل مختلف طبقے کی تھی، اور اس طبقے کے پاس بہت ذہین و فطین قائدین موجود تھے۔ اس کو حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی، مولوی مظہر علی اظہر، چوہدری افضل حق، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان قسم کے قائدین کی نہ ضرورت تھی اور نہ ہی یہ قائدین اس طبقے کی خواہشوں کا مظہر بن سکتے تھے۔ اور نہ ان کے جذبات کو ان کی خواہش کے مطابق زبان عطا کر سکتے تھے، لیکن بدقسمتی کو کیا کہیے کہ احرار کے قائدین اپنی حدود اور قیود کو کبھی نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے بار بار راست اقدام کی طرف دوڑنے کی کوشش کی۔ جیلوں کو بھر دیا، لیکن یہ نہ وہ جان سکے کہ جیل جانا اور ووٹ لینا۔ دو مختلف محاذ ہیں، ہندوؤں کے ہاں کی طبقاتی ساخت مختلف تھی، وہاں جیل جانے والے ووٹ بھی لے

سکتے تھے، کیوں کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، وہ دوڑوں کی تشفی کر سکتا تھا۔ ان کے حقوق کی ہر محاذ پر حفاظت کر سکنے کی سکت رکھتا تھا۔ لیکن احرار یہ فریضہ ادا کرنے کی اہل نہیں تھی۔ تا آنکہ وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی تحریک منظم نہ کرتی۔ جس میں مسلمانوں کے تمام پسے ہوئے طبقوں کو شعوری طور پر منظم کیا جاتا لیکن ان کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ احرار کے ان قائدین میں اس ضرورت کا گو بہت مبہم احساس ضرور رہا ہے، یہی احساس ان کو سامراج دشمن کیمپ میں قائم و دائم رکھتا رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ احرار مسلمانوں کی پہلی تنظیم ہے، جس نے سامراج کی بیرونی ریشہ دوانیوں کو اپنے طبقے کی محدود فکر کے باوجود سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہر قدم پر برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب ہی نہیں کیا۔ بلکہ مسلمانوں کے جو قائدین کسی طرح ان ریشہ دوانیوں کا شکار بھی ہوئے تو انہوں نے ڈٹ کر ان کی مخالفت کی۔ چنانچہ جب افغانستان میں برطانوی ریشہ دوانیاں، امان اللہ خان کو راستے سے ہٹانے کے منصوبے باندھ رہی تھیں تو یہ پنجاب کے پرانے خلافتی اس محاذ پر ڈٹ گئے، اور دراصل مرکزی خلافتی کمیٹی سے ان پنجابی خلافتیوں کی یہ آخری لڑائی تھی جس کے بعد مجلس احرار کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔

مسئلہ افغانستان اور بانیانِ احرار

جس وقت ۱۹۲۹ء میں افغانستان میں برطانوی سامراج کی شہ پر امان اللہ خان کی حکومت کے خلاف تحریک ابھرنے لگی۔ اور ہندوستان میں بھی امان اللہ خاں کے خلاف مسلم رائے عامہ کو متاثر کرنے کی کوشش کی جانے لگی تو پنجاب خلافت کمیٹی نے ان ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی اس رائے سے انہوں نے مرکزی خلافت کمیٹی کو بھی آگاہ کیا۔ اور ان سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ اس ضمن میں اقدام کریں۔ لیکن مرکزی خلافت کمیٹی کے سیکرٹری نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو جو اس وقت پنجاب خلافت کمیٹی کے سیکرٹری تھے جو خط لکھا وہ خاصا دلچسپ تھا۔ یہ خط و کتابت اب مولانا کے

صاحبزادے عزیز الرحمٰن نے اپنے والد ماجد کی سوانح میں شائع کر دی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد عرفان اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"مکرم بندہ مولانا حبیب الرحمٰن دام مجدہم

مسئلہ افغانستان میں آپ کی روش اور طریقہ کار معقول نہیں، ہماری ذاتی اطلاعات یہ ہیں کہ افغانستان میں سوائے چند نوجوانوں کے ایک متنفس بھی نہیں جو شاہ امان اللہ خان کی حکمتِ عملی سے موافق ہو۔ یہ مسئلہ کسی ایک گروہ کی بغاوت کا نہیں ہے۔ بلکہ تمام عمال حکومت وزراء اور تقریباً ساری پبلک کی مخالفت کا ہے اور یہ سارا کھیل کم از کم مجھے انقلاب افغانستان سے چار ماہ پہلے معلوم تھا۔ جب علی احمد خان بمبئی میں آئے تھے تب ان سے سارے حالات معلوم ہو گئے تھے؛ اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اب آئندہ افغانستان میں ضرور کوئی نہ کوئی تبدیلی ہو گئی۔ بہرکیف ہماری معلومات یہ تھی کہ سردار علی احمد خان، جنرل نادر خان اور دونوں بھائی سردار محمد ولی خان، شیر علی خان، والدہ امان اللہ خان اس پالیسی کے موافق نہیں تھیں خود انقلاب افغانستان نے بھی یہی بات ثابت کی ہے کہ فوج اور عمال حکومت موافق نہ تھے ورنہ قبیلہ خوست کی بغاوت چند ہفتوں میں ختم کر دی جاتی۔ لیکن ایک بچہ سقہ کی بغاوت جسے ڈاکو کہا جاتا ہے اتنی موثر اور عالمگیر ہو کہ اس کے سامنے ساری نظامی فوج ہتھیار ڈال دے اور اپنی بے چارگی کا اعلان کر دے۔ بہرحال ہماری اطلاعات افغانی سرکاری ذرائع سے یہ ہیں کہ بچہ سقہ برائے نام ہے اور اس کی پشت پر تقریباً سارا ملک ہے۔ ایسے حالات میں جو آپ کا رویہ ہے وہ بہت نامعقول ہے اور افغانستان کے لیے تباہ کن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ امان اللہ خان سے بہتر سرزمین افغانستان کے لیے دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان کو واپس لانے کی یہ بھی تدبیر نہیں کہ تمام علمائے افغانستان کو گالیاں دی جائیں۔ اور بچہ سقہ نام کا جو ایک شخص ہے اسے "کتا" اور کیا کیا کہا جائے۔ صورت یہی ہے کہ امان اللہ خان صاحب کو بھی سمجھایا جائے کہ ساری اصلاحات عورتوں کے ننگے بدن میں نہیں رکھی ہوئی ہیں ادھر علماء اور مشائخ اور قبائل کے سرداروں کو بھی سمجھایا جائے کہ یہ چیزیں اتنی اہم نہیں ہیں۔ کہ آپ ان کی وجہ سے (یعنی اصلاحات کی وجہ سے) ایک بہتر آدمی کو ضائع کر دیں بدنصیبی

یہ ہے کہ مرکزی خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں ورنہ ایک جگہ بیٹھ کر اگر کوئی مشورہ ہوتا تو سب ایک ہی رائے پر جمع ہو جاتے۔"

محمد عرفان

مولانا محمد عرفان آفس سیکرٹری مرکزی خلافت کمیٹی کے اس خط کے بعد مولینا شوکت علی نے غازی امان اللہ خان کے خلاف اخبارات میں بیان دیا۔ مولانا شوکت علی کے بیان کے جواب میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے حسب ذیل بیان دیا:

"میں یہ دیکھ کر بے حد مسرور ہوں کہ پنجاب کے قومی کارکنوں نے افغانستان کے معاملے میں بروقت رہنمائی کی ہے۔ اور یہ بات میرے لیے بہت زیادہ مسرت کا باعث ہے کہ تمام ہندو پریس اور ہندو لیڈروں نے پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ شاہ امان اللہ خان کی حمایت میں آواز بلند کی ہے۔ یہ یقین ہے کہ یہ حالات ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک مضبوط چٹان ثابت ہوں گے۔

مگر ان حالات کے ساتھ ساتھ مجھے مولانا شوکت علی کے بیان سے شدید صدمہ پہنچا مولانا شوکت علی کا بیان مجمل بھی ہے اور گمراہ کن بھی، مجھے حیرت ہے کہ علی برادران کی گزشتہ پانچ سالہ زندگی صرف مسلمان حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے میں گزری ہے ان دونوں بھائیوں نے جس وقت سے ترکی نے لفظ خلافت سے انکار کیا ہے تو غازی مصطفےٰ کمال کی اتنی شدید مخالفت کی، جس کو ہر مسلمان نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ سلطان ابن سعود کے معاملے میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ اس کی حکومت کو تباہ کرنے میں دونوں بھائی ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کر رہے ہیں۔ اب جبکہ سلطنت افغانستان کی تباہی کا فیصلہ دشمنان اسلام نے کر لیا ہے۔ اور وہ بظاہر کسی حد تک اپنے ارادوں میں بذریعہ باغیوں کے کامیاب بھی ہیں، ٹھیک اس وقت مولانا شوکت علی نے ایک مفتی کے انداز میں فری پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا:

"باغی افغانستان میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلامی احکام کی عزت اور مغربی تہذیب کے خلاف ایک شرعی جہاد ہے اور شاہ امان اللہ خان

غازی اپنی بد دینی کی وجہ سے تخت سے علیحدہ کیا گیا۔"

اس بیان میں مولانا شوکت علی نے یہ بھی کہا ہے کہ میں بچہ سقہ کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔ میرے خیال میں یہ الفاظ ان کی زبان سے ہندوستان کی رائے عامہ کے خوف سے نکلے ہیں، ورنہ ان کے بیان کا پہلا حصہ بچہ سقہ اور اس کے معاونین کی حرف بحرف تائید کرتا ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ مولانا شوکت علی کے بیان کا وہ حصہ جو غازی امان اللہ خان کے خلاف اور باغیوں کی حمایت میں ہے افغانستان میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہو چکا ہوگا۔ اس لیے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ دشمنان اسلام کی تمام طاقتوں سے زیادہ مولانا شوکت علی کا بیان شاہ امان اللہ خاں اور سلطنت افغانستان کے لیے نقصان رساں ثابت ہوگا۔ سلطان ابن سعود کی اس لیے مخالفت کی جاتی ہے کہ اس نے شریعت کا وقار سرزمین حجاز میں دوبارہ کیوں قائم کیا اور شاہ امان اللہ خان کی مخالفت یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ وہ شریعت کا مخالف ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ ہندو پریس کے بعد مسلم پریس میں سوائے اخبار زمیندار کے مسلمان اخباروں کی اکثریت شاہ امان اللہ خان کے بارے میں بزدلی سے کام لے رہی ہے اور بعض بدنیت اخبار شاہ امان اللہ خان کے خلاف مضامین لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان مسلم حقوق کی رٹ لگانے والے مسلم اخبارات سے سختی کے ساتھ یہ سوال کریں کہ افغانستان کے معاملے میں تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا ہے خدا مسلمان قوم کو اپنے دوست و دشمن کے سمجھنے کی توفیق دے۔"

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

رئیس احرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مولانا شوکت علی کے بیان کے بعد حسب ذیل فتویٰ علمائے ہندوستان کے پاس بھیجا:

محترم المکرم، السلام علیکم

ذیل کے سوالات ارسال خدمت ہیں، حالات کا اقتضا ہے کہ ان کا جواب جلد از جلد ملک میں شائع کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد صاف مختصر و

مدلل جواب ارسال فرمائیں گے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت شاہ امان اللہ غازی پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے اور باغیوں کی شرعی حیثیت سے امداد کی جارہی ہے جس سے دشمنانِ اسلام فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنت اسلام کو برباد کر رہے ہیں۔

سوالات

۱۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ شاہ امان اللہ غازی والئی افغانستان نے جو اصلاحات اپنے ملک میں جاری کی تھیں کیا وہ ان کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہوگیا؟

۲۔ (الف) کیا ان اصلاحات کا اجرا شاہ امان اللہ کے خلاف بغاوت کرنے کی شرعاً اجازت دیتا ہے؟

(ب) جو جماعت ان اصلاحات کی بنا پر بغاوت کرنا چاہتی ہے اس کی کسی قسم کی معاونت کرنا کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز ہے؟

۳۔ جو لوگ ان اصلاحات کے اجرا کی وجہ سے شاہ امان اللہ کو کافر کہتے ہیں، کیا وہ حق پر ہیں۔

۴۔ جبکہ دشمنان اسلام مختلف ذرائع سے سلطنت افغانستان کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں ان حالات میں شاہ امان اللہ کی امداد کرنا ہر مسلمان پر شرعاً فرض نہیں ہے؟

مسئلہ افغانستان کا سیاسی پس منظر

مرکزی خلافت کمیٹی اور علی برادران سے جو شدید اختلافات پیدا ہوئے اس پر مولانا عرفان صاحب کا غیر مطبوعہ خط اور مولانا شوکت علی صاحب کے بیان پر رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا بیان اپنی جگہ بہت سی تفصیلات رکھتا ہے مگر ان تفصیلات پر جنرل نادر خان کے خط مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۲۹ء اور جنرل نادر خان کے خط کے ساتھ شہزادہ فضل داد خان کا خط مولانا شوکت علی اور مرکزی خلافت کمیٹی

کے تباہ کن اثرات پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں:۔ ان خطوط کی آمد کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے تمام ساتھی مرکزی خلافت کمیٹی سے مسئلہ افغانستان میں کسی طرح بھی متفق نہیں ہو سکتے تھے، شہزادہ فضل داد خان کے خط کا مضمون حسب ذیل ہے:

از ڈیرہ اسماعیل خان

عالیجناب مخدومی و محترمی حضرت فخر الاحرار صاحب مدظلہ العالی،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج اقدس! اندریں زماں جبکہ ہر طرف سے حوادثات انقلابی رونما ہو رہے ہیں ہندوستان و افغانستان من حیثیت سیاسیات دشوار عبور طرائق سے گزر رہے ہیں، ایک سلطنت کا دوسری ہمسایہ سلطنت پر اثر انداز ہونا ہر حیثیت سے ضروری ہے افغانستان و سلطنت محروسہ کے برخلاف چند گمراہ و کوتاہ اندیش اشخاص نے ضرورت حال و اقتضائے زمانہ سے ناآشنا ہو کر جو گمراہ کن پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے۔ جو نقصان امن و اصلاح ملک و سلطنت ہے اس سے جناب بھی باخبر و واقف ہوں گے۔ اکابر اسلام کی متفقہ آواز کو نہایت سرد مہری و کم دانشی سے پس پشت ڈال کر بے سر و پا خود ساختہ افسانے گھڑ کر دولت عالیہ افغانستان کے خلاف بدظن کرنے کی جو ناپاک کوشش شروع کر رکھی ہے ان سب ہتھکنڈوں سے جناب والا مطلع ہوں گے۔ ان کے خلاف اعلان فرمائیں گے، جو افغانستان کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں اور ہماری مدد فرمائیں گے۔" (بالکل پرائیویٹ)

نیاز مند

شہزادہ فضل داد خان

کوچہ حافظ جمال ڈیرہ اسماعیل خان

اس خط کے ساتھ حسب ذیل خط جنرل نادر خان شہید کا موصول ہوا۔ جس کا مضمون درج ہے:

"در جرائد عالیہ ہند و جریدہ فریدہ افغانستان علاوہ از اظہار ہمدردی و

تاہم معنوی وقلبی کہ برادران ہندی راجع باحوال تباہ قابل ترحم افغانستان دارند۔ میخواہند کہ باعانت مالی نیز برادران متالم ومتاثر خودرا امداد مجاہدین حریت افغانی راتقویہ نمایند، وضعیت موجودہ مجاہدین خیلے بامداد مالی برادران ہمدرد خویش احتیاج دارد، ویگانہ وسیلہ پیشرفت مجاہدین ونجات افغانستان ازیں تہلکہ وبربادی وابستہ بہ امداد است الذمن ازیں عقیدہ عالیہ وارادۂ حسنہ برادران ہندی خود اظہار ممنونیت وامتنان نمودہ امید میکنیم کہ ارادۂ ذہنی خودشان زاوری لباس علمی پوشانیدہ ملت دردرسیدۂ افغانستان رادرایں حالت فلاکت وتباہی شان دستگیری نمایند ما۔

امید دارم کہ ایں حالت زار افغانستان ہم ہمدردان نوع بشر را متاثر نمودہ باشد دوست معاونت خود شاں را ایں ملت مصیبت زدہ کوتاہ نخواہد فرمود، وایں ملت را برابر ہمیشہ ممنون احسان خواہد نمود۔"

محمد نادر خان سپہ سالار ۲۸ راگست ۱۹۲۹ء

افغانستان میں برطانوی استبداد کی ریشہ دوانیوں کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا تھا کہ ہندوستان کے مشہور اخبار "مدینہ" کے مدیر مولوی نورالرحمن کو ۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ء کو افغانستان میں برطانوی ریشہ دوانیوں کے تذکرے کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور اسی موقع پر مولانا ظفر علی نے اپنی نظم میں کہا تھا:

خدا کی شان اک سقے کا بچہ
مقابل ہے محمد زائیوں کے
نہیں دیکھے پٹے کے ہاتھ اس نے
امان اللہ کے شیدائیوں کے
اسے اسلامیوں سے کیا سروکار
جو ٹکڑوں پر پلے عیسائیوں کے

احرار کا یہ گروہ اندرون ملک بھی اس وقت کے بائیں بازو کے رجحانات رکھنے

والی جماعتوں کے ساتھ ہمدردیاں رکھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب لاہور میں کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا اور اس میں مکمل آزادی کی قرارداد پیش ہوئی تو اس موقعہ پر بھی مولانا حبیب الرحمٰن نے گاندھی جی کی پیش کردہ قرارداد میں ترمیم کی اس قرارداد اور ترمیم کا تذکرہ مولانا نے اپنی یادداشت میں کیا ہے:

"کانگرس کے اجلاس میں کامل آزادی کی تجویز جب زیر بحث آئی تو گاندھی جی کو یہ اصرار تھا کہ اس تجویز کے آخری حصے میں وائسرائے کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا جائے۔ اور بم مارنے والوں کی مذمت کی جائے۔ اس پر گاندھی جی سے شدید بحث ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیال کی تائید کرنے میں، میں پہلا آدمی تھا۔ جس نے کہا کہ آزادیٔ کامل کی تجویز کے ساتھ وائسرائے سے ہمدردی کرنے کا پیراگراف شامل کرنا اپنی کمزوری اور غلامی کی نشانی ہے۔ میں نے صاف الفاظ میں کہا کہ وائسرائے سے ہمدردی کرنے کی بجائے بم مارنے والوں سے ہمدردی کرنی چاہیئے۔ میرے اس بیان کی پریس میں بڑی پبلسٹی ہوئی۔ انگریزی اخبارات میں مجھے تشدد پسند ونگ کے لیڈر کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس اجلاس کے زمانے سے پنڈت جواہر لال نہرو کے مجھ سے قریبی تعلقات پیدا ہو گئے۔ تجویز گاندھی جی کے منشاء کے مطابق پاس ہوئی مگر میری اور پنڈت نہرو جی کی تقریروں سے وائسرائے کی ہمدردی والا حصہ بے وزن ہو کر رہ گیا۔"

صرف یہی نہیں بلکہ کانگرس کے اس سالانہ اجلاس کے موقعہ پر انقلابی نوجوانوں کی جماعت "نوجوان بھارت سبھا" کا اجتماع بھی راوی کے کنارے اسی پنڈال میں ہوا۔ تو اس اجلاس میں بھی یہ احرار قائدین شریک ہوئے تھے۔

مذہب اور سیاست

آئینی موشگافیوں اور نہرو رپورٹ کی مسلمان امراء کی طرف سے شدید مخالفت

اور کانگرس کی غداری نے در اصل ان قائدین کو خاصا برگشتہ کر دیا اور یہ اپنی تمام سامراج دشمنی کے باوجود کانگرس سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ تاکہ وہ مسلمان عوام کو منظم کر کے کانگرس کے ساتھ برابری کی سطح پر سامراج دشمن محاذ قائم کر سکیں۔ اس انداز فکر میں خود مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک تھے۔ چنانچہ کئی ایک احرار زعماء کا کہنا ہے کہ مجلس احرار کے قیام میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مشیت اور تائید دونوں شامل تھے لیکن جب ایک بار مجلس احرار الگ سے قائم ہو گئی تو اس وقت مسلمان عوام کو منظم اور متحرک کرنے کی، تو بنیادی طور پر ایک صورت تھی، کہ مسلمان عوام کے مختلف طبقوں کے معاشی تقاضوں کو سمجھا جاتا اور ان بنیادوں پر ان کو منظم کر کے متحرک کیا جاتا۔ اور اس طرح سے دوسرے مذاہب کے پسے ہوئے طبقوں کے ساتھ ایک وسیع محاذ قائم ہو سکتا لیکن ان قائدین کا ماضی اور ان کا فکر ان کے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ اور وہ عوام کے معاشی تقاضوں کو سمجھنے کی بجائے مذہبی جذبات کو ہی حرکت اور تنظیم کی بنیاد بنانے پر مصر رہے۔

یہ درست ہے کہ وہ مذہب کے ان پہلوؤں پر زیادہ اصرار کرتے رہے جس میں غریبوں کی بھلائی اور معاشی انصاف کے اشارے ملتے ہیں۔ لیکن بنیاد مذہبی جذبات ہی رہے۔ چنانچہ انہی مذہبی جذبات پر انہوں نے اپنی مقبولیت کی بلند و بالا عمارت تعمیر کی۔ اور اس پر وہ سالہا سال تک اتراتے بھی رہے۔ کیونکہ ان کو بجا طور پر ناز تھا کہ مذہب کی بنیاد پر ہم متحرک کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہم جیل بھی جاتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی ہمارے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا۔ کیونکہ اگر کوئی مقابلے میں مذہب کو استعمال کر بھی لے گا۔ مگر وہ بہادری اور قربانی کا جذبہ کہاں سے لائے گا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ مذہب کا نعرہ یک رُخا ہوتا ہے وہ ایک دفعہ دل میں اتر جائے تو سماجی اور اقتصادی عوامل کی جانچ نہیں کرتا۔ خود چودھری افضل حق کو احرار کے اس پہلو کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ پہلے احرار مفکر تھے جنہوں نے اسلام کے معاشی پہلوؤں پر شدت سے اصرار کیا۔ لیکن سیاست میں مذہب کی آمیزش کے وہ ہر حال میں قائل رہے۔ چنانچہ اس آمیزش کی حمایت کرتے ہوئے وہ یوں لکھتے ہیں:

"لوگ بجا طور پر پوچھتے ہیں کہ احرار کو کیا ہو گیا کہ مذہب کی دلدل میں پھنس گئے۔ یہاں پھنس کر کون نکلا ہے جو یہ نکلیں گے؟ مگر یہ کون لوگ ہیں؟ وہی جن کا دل غریبوں کی مصیبتوں سے خون کے آنسو روتا ہے وہ مذہب اسلام سے بھی بیزار ہیں۔ اس لیے کہ اس کی کہانی شہنشاہیت اور جاگیرداری کی دردناک کہانی ہے۔ کسی کو کیا پڑی کہ وہ شہنشاہیت کے خس و خاشاک کے ڈھیر کی چھان بین کر کے اسلام کی سوئی کو ڈھونڈے تاکہ انسانیت کی چاک دامانی کا رفو کر سکے؟ اس کے پاس کارل مارکس کے سائنٹیفک سوشلزم کا ہتھیار موجود ہے وہ اس کے ذریعے سے امرا اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے اسلام کی اتنی لمبی تاریخ میں سے چند سال کے اوراق کو ڈھونڈ کر اپنی زندگی کے پروگرام بنانے کی فرصت کہاں؟ سرمایہ داروں نے ان برسوں کی تاریخ کے واقعات کو سرمایہ داری کے رنگ میں رنگا اور مساوات انسانی کی تحریک جس کو اسلام کہتے ہیں، مذہبی لحاظ سے عوام کی تاریخ نہ رہی اور نہ اس میں کوئی انقلابی سپرٹ باقی رہی۔ عامۃ المسلمین امیروں، جاگیرداروں کے ہاتھ میں موم کی ناک بن کر رہ گئے۔ ہندوستان میں اس وقت بھی وہ سب سے زیادہ مفلوک الحال مگر حال مست ہیں، انہیں اپنے حال کو بدلنے کا کوئی احساس نہیں۔ یہ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ خود علمائے مذہب انقلابی سپرٹ سے ناآشنا ہیں، اور وہ اب تک مذہب کی اموی اور عباسی عقائد کے مطابق تشریح کر رہے ہیں۔

تاہم کسی کی بے خبری یا کسی گروہ کا تعصب واقعات کو نہیں بدل سکتا۔ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نئے دور کے انقلابی تھے، درانتی اور کلہاڑا تو اب مزدوروں کی نشانی بنا۔ لیکن جس نے سرمایہ داری پر پہلے کلہاڑا چلایا اور قومی امتیاز کے ان ریشوں کو کاٹ کر رکھ دیا جس نے انسان کو انسان سے علیحدہ کر دیا تھا۔ صرف سرمایہ ہی طبقات پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ انسانوں میں گروہ بندی کرنے والے اور بھی محرکات ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ذریعہ مختلف نبیوں پر ایمان ہے۔ قومیں خدا پر ایمان کے نزاع پر مختلف نہیں بلکہ مختلف نبیوں پر ایمان لانے کے باعث الگ الگ ہیں۔ پہلے آمد و رفت کے وسائل کی کمی کی وجہ سے ہر ملک ایک الگ دنیا تھی، الگ الگ پیغمبروں کے ذریعے ہر ملک کی روحانی

احرار کی زندگی کی یہی بنیادی اساس تھی، جس پر اس نے تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ یہ نہ دیکھ پائے کہ جب وہ غریبوں کی حمایت کے لیے مذہب کو بنیاد بناتے ہیں اور بجا کرتے ہیں، تو اوپری طبقے بھی اپنی مدافعت کے لیے مذہب کو استعمال کرتے ہیں اور ان کے پاس چونکہ نشر و اشاعت کے وسائل اتنے وافر ہوتے ہیں کہ ان کی مدافعت بھی حملہ بن جاتی ہے۔ اور ان کا مذہب سچا اور غریب کا مذہب جھوٹا اور سوشلزم بنا دیا جاتا ہے۔ پھر یہ علمائے حق، غریب کی مدد کرنے اور ان کو منظم کرنے کی بجائے اپنی صفائی پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور بحث مذہب کی مختلف توجیہات پر مرکوز ہو جاتی ہے اور اصل مسئلہ سرمایہ داری اور بھوک کا، ظالم اور مظلوم کا، آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اوپری طبقے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹ جائے۔

احرار کا دس سالہ دورِ حیات اس امر کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ ان کی اٹھائی ہوئی تحریکیں، تمام قربانیوں اور خلوص و دیانت کے باوجود عوام کو زیادہ آگے نہ بڑھا سکیں یہ درست ہے کہ انہوں نے سامراج دشمنی کا جذبہ کبھی سرد نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے قربانی سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ لیکن اس کے باوجود وہ فعال تنظیم اور غریب محنت کش اور فلاکت زدہ مسلمانوں کے طبقاتی شعور کو اپنی پوری کوششوں کے باوجود تیز نہیں کر سکے۔ بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ ان کے اکثر قائد ابن الوقتی کا شکار ہو گئے۔ اور مقابلہ مذہب پرستی اور مذہب کو استعمال کرنے میں ہونے لگا۔

واقعہ یہ ہے کہ مجلس احرار ایک الگ جماعت کے طور پر قائم ہوئی تو مسلمانوں اور بالخصوص پنجاب کے مسلمان امرار طبقے نے بھی اس جماعت کے قیام پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس الگ تنظیم میں وہ اپنی فتح سمجھنے لگے کہ کم از کم قید و بند کے مصائب جھیلنے والے قائدین کا گروہ کانگرس سے تو الگ ہوا۔ اور کانگرس جن لوگوں کی قربانیوں کے سہارے اپنے آپ کو تمام اقوام اور مذاہب کا نمائندہ سمجھتی اور اس کے منوانے پر مصر رہتی ہے وہ احرار اور دعوے بہت حد تک کمزور ہو گئے۔ دوسرے یہ

تربیت کی ضرورت تھی۔ ایک ملک میں بیٹھ کر سب ملکوں میں پیغام پہنچایا جا سکتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہوا۔ آپ نے لا نبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں) کا اعلان کر کے دنیا کو اتحاد کا مژدہ سنایا۔ کہ وہ آئندہ نبیوں کی بنا پر قوموں کی تفریق ختم ہو گئی۔ آؤ ایک محکم دین کی طرف آؤ یہ سب کے حالات کے مطابق ہے۔ اسلام تمہارے سارے عوارض کا مکمل نسخہ ہے۔ زمانے نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بتدریج دُور دُور کے ملک آمد و رفت کے سلسلوں میں آسانیوں کے باعث نزدیک تر ہوتے گئے۔ اب تو دور دراز ملک ایک شہر کے محلوں سے بھی قریب معلوم ہونے لگے ہیں۔ اس لیے ملک ملک کے لیے علیحدہ پیغامبر کی ضرورت نہ رہی تھی۔

اب انسانی دماغ کافی نشوونما پا چکا تھا۔ لوگ اپنا بھلا بُرا خود سمجھنے لگے۔ اب ایک سچائی پیش کرنا کافی ہے۔ باقی معاملہ لوگوں کی سمجھ پر چھوڑنا کفایت کرتا ہے۔ مذہب کی سچائی اب سمجھ سے بالا نہیں۔ بلکہ تعصب کے باعث اسے قبول کرنے میں دقت ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آتے ہی اہل دنیا کی عقل اور علم نے حیرت انگیز ترقی کی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے معنی یہ تھے کہ اب انسانیت سن شعور کو پہنچ چکی ہے۔ اب کسی سکول ماسٹر کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ دنیا کے حالات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ سچی اور جھوٹی بات میں فرق کر کے وہ صحیح راہ تلاش کر سکتے ہیں اب مکمل سچائی معینی اسلام ہم تک پہنچ گیا۔ اب کسی نبی کی ضرورت نہ رہی اگر ہم نبوت کا سلسلہ ابھی تک جاری مان لیں تو پھر مختلف نبیوں پر ایمان کے باعث قوموں، ملکوں پر اور انسانیت میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رہے گا پہلے تو ملک ملک ایک الگ الگ دنیا تھی۔ الگ الگ نبیوں کی ضرورت تھی۔ اب جب دنیا سمٹ کر ایک کنبہ میں رہتی ہے۔ تو نبوت کے مختلف دعویداروں کا آنا دنیا کو تقسیم بلا ضرورت کرنے سے کم نہ تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لا نبی بعدی کا ارشاد دنیا کے لیے رحمت کا پیغام اور انسانیت کے لیے خوشخبری تھی۔

(تاریخ احرار ص۷۶)

امرار یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ ان جیالے قائدین کو کانگرس سے الگ ہونے کی صورت میں اپنے استعمال میں لے آئیں گے۔ تیسرے فرقہ وارانہ تنظیم کے طور پر 'احرار' ہندو سے لڑنے پر مجبور ہو گی اور اس کا انگریز دشمنی کا جذبہ سرد پڑ جائے گا۔ اور امرار کے طبقے پر انگریز کا پٹھو ہونے کا الزام بھی لگنا بند ہو جائے گا۔ لیکن اوپری طبقے کے مسلمان زعماء کو اس ضمن میں خاصی ناکامی ہوئی۔ کیونکہ جہاں تک احرار کو الگ تنظیم کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ وہاں تک تو مسلمانوں کے اوپری طبقے کو کسی حد تک کامیابی ہوئی ہو تو ہو، لیکن جب احرار نے مسلمان عوام کو براہ راست سامراج دشمن نعروں پر منظم کرنا شروع کیا تو اوپری طبقے کو سخت مایوسی ہوئی۔ مجلس احرار نے پہلے دن ہی اس سلسلے میں اپنی پوزیشن واضح کر دی تھی، چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۱۱ جولائی ۱۹۳۱ء کو اپنے پہلے خطبہ صدارت میں واشگاف الفاظ میں اپنی نئی جماعت کے موقف کا اعلان کر دیا اور کہا:

"میں ہندوستان کی تمام اقوام کو کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جماعت احرار کسی قوم کے ساتھ بے انصافی نہیں چاہتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں وہ اچھوت بن کر رہنے کے لیے بھی تیار نہیں مسلمان ہندوستان میں برابر کے حقدار ہیں۔ وہ ہندوستان کی حکومت میں برابر کے حصہ دار ہو کر رہیں گے۔

ہندو پریس کے نزدیک ہر مسلمان اس لیے فرقہ پرست ہے کہ وہ مسلمان ہے اگرچہ اس نے ملک اور قوم کے لیے زبردست قربانیاں دی ہیں۔ لیکن جہاں اس نے کسی مسلمان پر ظلم ہوتے دیکھ کر اس کی امداد کی اسی وقت اسے فرقہ پرست کا خطاب مل گیا۔

کوئی مسلمان تمام عمر کانگرس کا وفادار رہے۔ مگر وہ کسی ایک ہندو کی شخصی رائے کی مخالفت کرے تو فرقہ پرست ہے۔ اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ نہ میں قوم پرست ہوں نہ فرقہ پرست صرف مسلمان ہوں۔ میں نے آج تک اپنے ملک اور قوم سے کبھی غداری نہیں کی۔ ہندو پریس میں اگر آج بھی

تھوڑا سا انصاف کا جذبہ آجائے تو میں یقین کرتا ہوں کہ تمام جھگڑے آج ہی ختم ہو جائیں۔

ہندوستان میں مسلمان دو سیاسی جماعتوں میں تقسیم ہیں، ایک وہ ہیں جو کانگرس سے مل کر کام کر رہے ہیں۔ اور دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں، کہ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا ہی مسلمان کی عزت و آبرو کا باعث ہے۔ مسلمان تب ہی زندہ رہ سکتے ہیں، کہ جنگ آزادی میں ہر قوم سے بڑھ کر حصہ لیں۔ غیر کانگریسی مسلمانوں کے سامنے سوائے ہندوؤں کو ملامت کرنے، انہیں برا بھلا کہنے، انگریز اور ہندوؤں سے ہمیشہ مسلمانوں کو ڈرانے کے سوا کوئی پروگرام نہیں۔

میری خواہش ہے کہ پنجاب کے مسلمان اس کثرت سے کانگریس میں حصہ لیں کہ دوسروں کو کانگریس میں جگہ نہ مل سکے۔ ہندو کہتا یہ ہے کہ مسلمان کانگریس میں آئیں اور چاہتا یہ ہے کہ نہ آئیں۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان اگر کانگرس میں آئے تو ان کی پولٹیکل طاقت بڑھ جائے گی۔ اور ہندوؤں کی قوم پرستی کا راز ان پر کھل جائے گا۔ ابھی تک کانگریس کے دفتروں میں مسلمانوں کو اچھوت سمجھنے والے ہندو موجود ہیں۔ جنگ آزادی شروع کرنے سے پہلے کانگریس کے جلیل القدر رہنماؤں نے نہرو رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ آئندہ کوئی نظام حکومت منظور نہیں کیا جائے گا۔ جس میں آزاد خیال مسلمانوں کی رضامندی حاصل نہ ہوگی۔"

اپنے اسی خطبہ صدارت میں مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے آخر میں واشگاف الفاظ میں کہا تھا:

"ہندوستان کی تمام مشکلات کا حل صرف ایک ہے کہ ہندوستان کے کسانوں، مزدوروں کی تنظیم کی جائے اور بجائے ایک سرمایہ دار حکومت کے، غریبوں کی حکومت قائم ہو۔ اگرچہ میں کانگریسی ہوں اور ہمیشہ کانگریس کے

جھنڈے تلے کام کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں پس و پیش نہیں ہے کہ کانگریس کی محنت و قربانی کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی حکومت انگریز سے نکل کر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں چلی جائے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مزدور اور کسان پوری طاقت سے کانگریس پر قبضہ کر لیں اور کانگریس سے تمام سرمایہ دار عناصر کو ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ کانگریس نے مکمل آزادی کا جو ریزولیشن لاہور میں منظور کیا تھا۔ اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں کوئی قوم اقلیت و اکثریت کی وجہ سے نہ زندہ رہتی ہے اور نہ مرتی ہے۔ دنیا میں صرف وہی قوم زندہ رہتی ہے جس کے افراد نیک نیت، بہادر، صاحب عقل اور صاحب ایثار ہوں۔ مجھے یہ سن کر بے حد تکلیف ہوتی ہے، جب کوئی مسلمان کہتا ہے کہ ہم اس لیے کمزور ہیں کہ ہم ہندوستان میں اقلیت میں ہیں، اُٹھو اپنے اندر زندگی پیدا کرو اور ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دو، جس قوم کے ہاتھ سے ہندوستان کو آزادی نصیب ہوگی۔ وہی سربلند ہو کر رہے گی۔"

(رئیس الاحرار از جامعی صفحہ ۱۵۳)

اس موقف کے ساتھ مجلس احرار وجود میں آئی۔ اب اس مقبولیت کی عمارت کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے درپیش مسائل کو اپنے ہاتھ میں لے کر سلجھانا تھا۔ کہ وہ اپنی تنظیم کو اپنی قربانیوں سے فعال بنا سکے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک یہ جماعت مسلسل ہنگاموں اور تحریکوں میں الجھی رہی جب اس کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس وقت بھی یہ جیلوں کے سہارے زندہ تھی، جب غیر مقبول ہوئی تو اس غیر مقبولیت کے داغ دھونے کے لیے بھی جیل کے دروازوں پر ہی دستک دینی پڑی۔ بہر حال اجمالاً ان تحریکوں اور ہنگاموں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔